# اُردُو (لازمی)

گیارھویں جماعت

شہر یار پبلی کیشنز، نوشہرہ

برائے

این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور

# اُردُو (لازمی)

گیارھویں جماعت

شہریار پبلی کیشنز، نوشہرہ

برائے

این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور

تیار کردہ این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور و منظور کردہ قومی ریویو کمیٹی
وفاقی وزارت تعلیم، حکومت پاکستان، بطور واحد نصابی کتاب برائے
جماعت یازدہم (اردو) برائے صوبہ سرحد و قبائلی علاقہ جات

مدیران

غلام محمد قاصر ——— ڈاکٹر ممتاز منگلوری

مؤلفین

پروفیسر صوفی عبدالرشید: ———

پروفیسر محمد اکرم: ———

دُرِ شہوار بیگ: ———

غلام محمد قاصر: ———

ٹاپ پرنٹرز پشاور

عالمی معیاری کتاب نمبر 969-8563-05-9

# فہرست

# حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# موجودہ تعلیم

سر سید احمد خان

قوم کی تعلیمی ترقی کے متعلق اب تک مختلف جلسوں میں بہت سے ریزولیشن[1] پاس ہوئے اور بہت سے لکچر[2] دیے گئے جو ہنسانے والے بھی تھے اور رُلانے والے بھی تھے، فصاحت و بلاغت میں بھی بے نظیر تھے اور اپنے مضامین کے لحاظ سے بھی بے مثل تھے، وہ لکچر ہمارے دل پر مختلف قسم کے اثر پیدا کرتے تھے۔ جب ان لکچروں یا نظموں میں ہمارے بزرگوں کی شان و شوکت، اُن کی اولوالعزمی۔ اُن کی جاہ و حشم، اُن کی قابل قدر سویلائزیشن[3]، اُن کی علمی لیاقتیں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کا کمال بیان ہوتا تھا تو ہمارا دل پھولتا تھا اور ہم اپنے جاموں میں پھولے نہیں سماتے تھے اور ایک قسم کا غرور و فخر ہم میں پیدا ہوتا تھا کہ ہم ایسے آدمیوں کی اولاد ہیں مگر جب ہمارے موجودہ حال کا بیان ہوتا تھا تو ہمارے دل پژمُردہ اور غمگین ہو جاتے تھے اور افسوس کرتے تھے کہ ہم ایسے اسلاف کے ایسے ناخلف فرزند ہیں مگر افسوس ہے کہ یہ پچھلا اثر بہت ہی تھوڑی دیر ہم میں رہتا تھا، ہاں ہمارے آنسو بھی نکلتے تھے، مگر وہ اپنے ساتھ ہمارے اس رنج کو بہالے جاتے تھے۔ مجھ میں نہ ایسی فصاحت ہے اور نہ طاقت کہ میں اپنے ان مخدوم لکچراروں کی پیروی کروں۔ میرا تو اس رنگریز کا سا حال ہے جس کو صرف اموا رنگ آتا تھا اور وہ سب رنگوانے والوں سے، گو کہ وہ کوئی رنگ رنگوانا چاہیں، یہی کہتا تھا کہ تم پر تو اموا رنگ کِھلتا ہے۔ پس میں اپنی قوم کے موجودہ حال پر نظر کروں گا اور آپ سے پوچھوں گا کہ اس کی ترقی اور فلاح دارین کیوں کر ہو سکتی ہے۔

گزشتہ زمانے میں ہمارے بزرگوں کی حالت نہایت عمدہ اور بے نظیر تھی۔ گزشتہ زمانے کی سویلائزیشن جسے یاد کر کے ہم کو رونا چاہیے ہمارے بزرگوں کو نصیب تھی۔ اَخلاق، محبت، مروّت، دوستی، دوستی کا برتاؤ، دوستی کا پاس، نیکی، فیاضی، متانت، چھوٹوں کے ساتھ الفت، بڑوں کا ادب، غریبوں کے ساتھ ہمدردی، قومی یگانگت سب ان میں جمع تھی۔ قومی تعلیم دینی یا دنیوی کا ایسا مستحکم اور قابل ادب سلسلہ تھا جس کی نظیر تمام دنیا کی کسی قوم میں پائی نہیں جاتی۔ ایک بزرگ مقدس عالم دن رات بلا خیال دنیوی فائدے کے خدا کی رضامندی اور اپنی قوم اور اپنے

---
1. Resolution 2. Lecture 3. Civilization

مذہب کے لوگوں کی تعلیم کے لیے مسجد کے کونے یا خانقاہ کے حجرہ یا اپنے مکان کی کوٹھڑی میں بیٹھا پڑھاتا تھا، پھر غریب سے غریب آدمی پڑھنے کو آوے یا بادشاہ شہنشاہ کا بیٹا، سب کی تعلیم میں مساوی برتاؤ کرتا تھا۔ اخیر زمانہ میں بھی مگر اس زمانہ سے پہلے کثرت سے ایسے بزرگ ہر قصبہ و شہر میں پائے جاتے تھے جس نے اس کو دیکھا ہے آدمی نہیں ان کو فرشتہ پایا ہے۔ اس کی صحبت کی برکت سے طالب علموں کے اخلاق درست ہوتے تھے۔ نیکی ان کے دل میں پیدا ہوتی تھی، شاید اب بھی دو ایک بزرگ ایسے ہوں مگر وہ ایسے شاذو نادر ہیں جو تمام قوم کو فائدہ پہنچانے کے لیے ناکافی ہیں۔

سب سے بڑا مقصد تعلیم و تربیت سے انسان میں نیکی اور اخلاق اور انسانیت اور آدمیت پیدا کرنا ہے، وہ ہم کو اپنے بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتا تھا۔ پشت در پشت بطور ورثہ کے ہمارے بزرگوں کو پہنچتا تھا اور ان سے ہم کو۔ ہمارا ملک، جو خاص ہندوستان یا متوسط ہندوستان کہلاتا ہے، ہر ایک امر میں، کیا علم، کیا معاشرت و تہذیب میں، کیا زبان میں دوسرے ملک کے لیے نظیر تھا۔ انقلاباتِ زمانہ سے نہ اب وہ زمانہ ہے اور نہ اب وہ لوگ جن کی صحبت سے ہم تربیت پاتے تھے۔

انسان کے قواء جب ضعیف ہو جاتے ہیں اور اعتدالِ مزاج درہم برہم ہو جاتا ہے، تو وہ متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی حال قوم کا ہوتا ہے، جب اس کو تنزل ہوتا ہے تو کسی ایک چیز میں تنزل نہیں ہوتا بلکہ مذہب، اخلاق، تعلیم، راست بازی، دیانت داری، سویلائزیشن، دولت، تمکنت، متانت، سب چیزیں تنزل ہوتا ہے اور جو لوگ اس کی اصلاح کے درپے ہوتے ہیں وہ حیران ہو جاتے ہیں کہ کس کس چیز کا علاج کریں۔ مگر جب غور کیا جاتا ہے تو بجز تعلیم و تربیت کے اور کوئی اس کا علاج نظر نہیں آتا۔

تعلیم میں جو مشکلات ہیں وہ آپ پر پوشیدہ نہیں ہیں۔ ہم کو بحیثیت مُسلمان ہونے کے قوم کو قوم بنانے کے لحاظ سے مذہبی تعلیم کی ضرورت ہے، کیونکہ مسلمانوں میں مذہب اسلام کی رو سے قوم کا لفظ نسل کے متحد ہونے پر نہیں بولا جاتا ہے بلکہ جس نے کلمہ پڑھا اور اسلام لایا، گو کہ وہ باعتبار نسل کے کوئی ہو، وہ سب ہمارے بھائی اور ہماری قوم میں داخل ہیں۔ اسلام کی رُو سے اخوّت اور اتحاد قومی صرف اسلام پر منحصر ہے۔ **قال اللہ تعالیٰ انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون**[۴] پس جب کہ مدار قومیّت اسلام پر ہے تو ہم کو اپنی قوم کو مذہبی تعلیم دینا اقل درجہ جہاں تک کہ عقائد و فرائض سے متعلق ہے ضرور ہے۔

دنیوی علوم سے ہم اپنی قوم کو محروم نہیں رکھ سکتے کیونکہ اگر اس سے محروم رکھیں تو وہ دنیا میں رہنے کے

---

۴۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ بے شک مُسلمان آپس میں بھائی ہیں۔ پس اصلاح کرو اپنے بھائیوں کے درمیان اور اللہ سے ڈرو شاید تم پر رحم کیا جائے۔

قابل نہیں ہوتی۔ ہم قبول کرتے ہیں کہ دنیا و مافیہا فانی ہے اور زندگی چند روزہ ہے مگر کم بخت وہ چند روز ہی ایسے کٹھن ہیں جن میں جب تک کہ ہم ان میں رہنے کے قابل نہ ہوں رہ نہیں سکتے۔

ہمارے دنیوی علوم عقلی و نظری، علمی و عملی کی کتابیں تقویم پارینہ کی مانند ہو گئی ہیں جو کسی کام آنے کے لائق نہیں ہیں اور اس لیے ہم کو بہ مجبوری ان علوم کو موجودہ یورپ کی کتابوں سے حاصل کرنا پڑتا ہے جن کو ہم بوعلی و فارابی، ابن رشد، رازی، ارسطو اور ساہ زی سیوس اور مالا ناؤس اور دیگر علماء یونانی کی تصنیفات سے جو عربی میں ترجمہ ہو گئی ہیں حاصل کرتے ہیں۔

لٹریچر[5] ایک ایسا علم ہے جو ہر ایک کے ساتھ مخصوص ہے مگر اس زمانہ میں اس میں بھی طریق بیان اور طرز ادائے مضمون نے ایسی ترقی کی ہے کہ ہم اپنی قدیم طرز تحریر اور طریق ادائے مضمون کے چھوڑنے اور اس جدید طرز کے اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ لفاظی اور ہجر و وصل کی شاعری، مبالغہ اور اَن نیچرل[6] مدح سرائی صنائع و بدائع جو ایک زمانہ میں حسنِ تحریر سمجھے جاتے تھے اب حد سے زیادہ معیوب ہیں۔

اگر ہم ایک کالج بھی ایسا بنالیں جس میں ہم اپنی قوم کے بچّوں کو اس طرح پر تعلیم و تربیت دے سکیں جیسی دینی چاہیے تو بلاشبہ اس میں ایک محدود تعداد ہوگی مگر اس محدود تعداد کا اس قسم کی تربیت پانا قومی فلاح کی نشانی ہوگی۔ یہی محدود تعداد جب اس قسم کی تعلیم پاکر نکلیں گے اور ملک کے مختلف حصّوں میں پھیلیں گے تو وہ قومی ترقّی کے لیے بہ منزلہ خمیر کے ہوں گے اور قومی باغ کے لیے بہ منزلہ تخم کے۔ اور امید ہے کہ ان سے سر سبز و بارآور درخت پیدا ہوں گے۔

لوگ شکایت کرتے ہیں کہ انگریزی تعلیم سے طالب علموں کی عادات اور اخلاق خراب ہو جاتے ہیں اور آزادی ان میں سما جاتی ہے۔ بڑوں کا اَدَب، ماں باپ کا اَدَب، اُن کی عزّت، اُن کی فرمانبرداری ان میں سے جاتی رہتی ہے۔ اگرچہ مجھ کو ایسے لوگوں سے واسطہ نہیں پڑا کیونکہ میں اپنے کالج کے طالب علموں کو ایسا نہیں پاتا۔ وہ نہایت مُہذب اور بزرگوں اور اُستادوں کا اَدَب کرنے والے ہیں، لیکن بالفرض اگر یہ شکایت صحیح ہے تو یہ اس حالت میں کہ چار مسلمان بچّے لاہور میں اور چار کلکتہ میں اور چار بمبئی میں اور چار مدراس میں اور کچھ مشنری کالجوں میں پڑھتے ہوں، اگر اُن کے اُستاد مُہذّب و تربیّت یافتہ بھی ہوں اور یہ بھی فرض کرو کہ وہ اُستاد اُن کی تربیّت پر بھی خیال رکھتے ہوں تو ایک دو گھنٹہ ان کو اُستاد کے سامنے شیکسپیئر[7] یا ناول یا ہسٹری[8] یا فلسفہ پڑھ لینا اور اس کے بعد شہر کے بازاروں اور گلیوں میں پھرنا جن میں سامان بد تہذیبی بہ نسبت زمانہ سابق کے کثرت سے موجود اور بہ نسبت سابق کے سہل الوصول و ارزاں ہے، اور کسی مہذب سوسائٹی کا ان کو میسر نہ آنا، اس

---

۵۔ Literature ۶۔ Un-natural ۷۔ Shakespeare ۸۔ History

نقصان کو جس کی شکایت کی جاتی ہے ، رفع نہیں کر سکتا۔

مگر بایں ہمہ ہم کو سوچنا چاہیے کہ جو ہم کر سکتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ بجز اس کے اور کچھ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ ہم ان طالب علموں پر نماز پڑھنے کی ، روزہ رکھنے کی تاکید کریں۔ ان کے نماز روزہ کے لیے جو ضروریات ہیں ان کو مہیا کریں۔ اس سے بڑھ کر یہ کر سکتے ہیں کہ ہم کسی لائق عالم کو ان کی نصیحت اور ان کے امور دینی کی حفاظت کے لیے مقرر کریں تاکہ وہ اپنے وعظ و نصیحت سے ان کے عقائد اور ان کے خیالات فاسد کو اگر وہ درست کر سکتا ہے ، درست کرے۔ مذہبی تعلیم کو جس قدر ہو سکے ان کے کورس تعلیم میں داخل کر دیں اور ان تمام امور کے اہتمام کو ایک جزو تعلیم کا قرار دیں جیسے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ مدرسۃ العلوم میں تمام امور کا اہتمام ، جیسا کہ ممکن ہے ، ہوتا ہے۔

قوم کو اگر قومی ترقی اس طرح کی منظور ہو تو یہ بھی ہوگا کہ جو مسلمان نوجوان کالج میں رکھے جاویں وہ عمدہ ہوں۔ اگر عمدہ نہ ہوں تو متوسط حالت میں رکھے جاویں۔ ان کے رہنے کے مکانات صاف اور درست ہوں۔ ان کو پاکیزہ اور صاف لباس پہننے کی عادت ڈالی جاوے۔ سلیقہ سے رہنا ، اپنے رہنے کے مکان کو درست رکھنا ان پر لازم کیا جاوے۔ سب کو اگر ممکن ہو ایک سی حالت میں رہنے کی تدبیر کی جاوے۔ کھانے کا انتظام ایسی طرح پر ہو کہ جس سے ان کو کھانے کا آپس میں دوستانہ اور برادرانہ طریقہ سے مل کر کھانا آجاوے جو ایک بڑی تدبیر قومی موانست ، قومی یگانگت کی ہے۔

## مشق

۱ - سرسید نے گزشتہ زمانے میں ہمارے بزرگوں کی حالت کا کیا نقشہ کھینچا ہے؟

۲ - سرسید کے نزدیک تعلیم کا سب سے بڑا مقصد کیا ہے؟

۳ - لوگوں کو انگریزی تعلیم سے کیا شکایات تھیں؟ سرسید نے تعلیم کے بڑے مقصد کے تحت ان شکایات کا کیا جواب دیا ہے؟

۴ - مسلمان کن معنوں میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں؟

۵ - حقیقی اور غیر حقیقی تذکیر و تانیث کا کیا مطلب ہے؟ پانچ ، پانچ ایسے اسم لکھیے جو صرف مذکر اور مونث کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

# روز مرّہ اور محاورہ

خواجہ الطاف حُسین حالی

محاورہ لغت میں مطلقاً بات چیت کرنے کو کہتے ہیں، خواہ وہ بات چیت اہلِ زبان کے روز مرہ کے موافق ہو خواہ مخالف۔ لیکن اصطلاح میں خاص اہلِ زبان کے روز مرّہ بول چال یا اسلوب بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضرور ہے کہ محاورہ تقریباً دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے، کیونکہ مفرد الفاظ کو روز مرّہ یا اسلوب بیان نہیں کہا جاتا۔ بخلاف لغت کے کہ اس کا اطلاق ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا ایسے الفاظ پر جو منزلہ مفرد کے ہیں، کیا جاتا ہے۔ پانچ اور سات دو لفظ ہیں جن پر الگ الگ لغت کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ مگر ان سے ہر ایک کو محاورہ نہیں کہا جائے گا بلکہ دونوں کو ملا کر جب پان سات کہیں گے تب محاورہ کہا جائے گا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ترکیب جس پر محاورے کا اطلاق کیا جائے، قیاسی نہ ہو بلکہ معلوم ہو کہ اہل زبان اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پان سات یا سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کر کے چھ آٹھ یا آٹھ چھ یا سات نو بولا جائے گا تو اس کو محاورہ نہیں کہیں گے، کیونکہ اہلِ زبان کبھی اس طرح نہیں بولتے یا مثلاً بلا ناغہ، پر قیاس کر کے اس کی جگہ بے ناغہ، ہر روز کی جگہ ہر دن، روز روز کی جگہ دن دن یا آئے دن کی جگہ آئے روز بولنا، ان سب میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا کیونکہ یہ الفاظ اس طرح اہلِ زبان کی بول چال میں کبھی نہیں آتے۔

کبھی محاورے کا اطلاق خاص کر ان افعال پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں، بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، جیسے "اُتارنا" اس کے حقیقی معنی کسی جسم کو اُوپر سے نیچے لانے کے ہیں۔ مثلاً گھوڑے سے سوار کو اتارنا، کھونٹی سے کپڑا اُتارنا، کوٹھے پر سے پلنگ اُتارنا، لیکن ان میں سے کسی پر محاورے کے دوسرے معنی صادق نہیں آتے، کیونکہ ان سب مثالوں میں اتارنا، اپنے حقیقی معنوں میں مُستعمل ہوا ہے۔ ہاں نقل اُتارنا، دل سے اُتارنا، پہنچا اُتارنا، یہ سب محاورے کہلائیں گے کیونکہ ان سب مثالوں میں اتارنے کا اطلاق مجازی معنوں میں کیا گیا ہے یا مثلاً "کھانا" اس کے حقیقی معنی کسی چیز کو دانتوں میں چبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اُتارنے کے ہیں۔ مثلاً روٹی کھانا، دوا کھانا وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسی کو دوسرے معنی کے لحاظ سے محاورہ

نہیں کہا جائے گا، کیونکہ ان سب مثالوں میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے ہاں غم کھانا، قسم کھانا، دھوکا کھانا، پچھاڑیں کھانا، ٹھوکر کھانا، یہ سب محاورہ کہلائیں گے۔ محاورے کے معنی جو ہم نے اوّل بیان کیے ہیں وہ عام یعنی دُوسرے معنوں کو بھی شامل ہیں۔ لیکن دوسرے معنی پہلے معنی سے خاص ہیں۔ پس جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے گا، اس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے اس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔ مثلاً "تین پانچ کرنا" یعنی جھگڑا کرنا، اس کو دونوں معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ ترکیب اہلِ زبان کی بول چال کے موافق ہے اور اس میں تین پانچ کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بولا گیا ہے، لیکن روٹی کھانا اور میوہ کھانا، پان سات یا دس بارہ وغیرہ صرف معنوں کے لحاظ سے محاورہ قرار پا سکتے ہیں نہ دوسرے معنوں کے لحاظ سے کیونکہ یہ تمام ترکیبیں اہل زبان کی بول چال کے موافق نہیں ہیں۔ مگر ان میں کوئی لفظ مجازی معنوں میں استعمال نہیں ہُوا۔ آئندہ ہم دونوں معنوں میں تمیز کے لیے پہلی قسم کے محاورے پر روز مرّہ کا اور دوسری قسم پر محاورے کا اطلاق کریں گے۔

روز مرّہ اور محاورہ میں من حیث الاستعمال ایک اور فرق بھی ہے۔ روز مرّہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو تقریر و تحریر اور نظم اور نثر میں ضروری سمجھی گئی ہے، یہاں تک کہ کلام میں جس قدر کہ روز مرّہ کی پابندی کم ہوگی اسی قدر فصاحت کے درجے سے ساقط سمجھا جائے گا۔

مثلاً آج تک ان سے ملنے کا موقع نہ ملا۔ یہاں "نہ ملا" کی جگہ "نہیں ملا" چاہیے یا "وہ خاوند کے مرنے سے درگور ہوگئی" یہاں "زندہ درگور" چاہیے یا "سوگئے جب بخت تب بیدار آنکھیں ہوگئیں" کی جگہ "ہوئیں" چاہیے۔ یا "دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہُوا" یہاں "کیا ہوگیا" چاہیے۔

الغرض نظم ہو یا نثر دونوں میں روز مرّہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو، نہایت ضروری ہے، مگر محاورے کا ایسا حال نہیں ہے، محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے تو بلاشبہ پست شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتا ہے، لیکن شعر میں محاورے کا باندھنا ضروری نہیں، بلکہ ممکن ہے شعر بغیر محاورے کے بھی فصاحت کے اعلیٰ درجے پر واقع ہو ممکن ہے کہ ایک پست اور ادنیٰ درجے کے شعر میں بے تمیزی سے کوئی لطیف و پاکیزہ محاورہ رکھ دیا گیا ہو۔ ایک مشہور شاعر کا شعر ہے۔

گو ہرِ اشک سے لبریز ہے سارا دامن
آج کل دامنِ دولت ہے ہمارا دامن

اس شعر میں کوئی محاورہ نہیں باندھا گیا باوجود اس کے شعر تعریف کے قابل ہے۔ دوسری جگہ شاعر کہتا ہے۔

اُس کا خط دیکھتے ہیں جب صیاد
طوطے ہاتھوں کے اُڑا کرتے ہیں

اس شعر میں نہ کوئی خوبی ہے، نہ مضمون، صرف ایک محاورہ بندھا ہُوا ہے اور وہ بھی روز مرّہ کے خلاف، یعنی "اُڑ جاتے ہیں" کی جگہ "اُڑا کرتے ہیں"۔ محاورے کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہیے جیسے کوئی خوبصُورت عضو بدن انسان میں اور روزمرہ کو ایسا جاننا چاہیے جیسے تناسبِ اعضا بدنِ انسان میں۔ جس طرح بغیر تناسبِ اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصُورتی سے حسنِ بشری کامل نہیں سمجھا جا سکتا اسی طرح بغیر روز مرّہ کی پابندی کے محض محاورات کے جا و بیجا رکھ دینے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔

شعر کی معنوی خوبی کا اندازہ اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان دونوں کر سکتے ہیں لیکن لفظی خوبیوں کا اندازہ صرف اہلِ زبان کا حصہ ہے۔ اہلِ زبان عموماً اُس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں روز مرّہ کا استعمال زیادہ کیا گیا ہو اور اگر روز مرّہ کے ساتھ محاورے کی چاشنی بھی ہو تو وہ اُن کو اَور بھی مزہ دیتی ہے۔

مگر عوام کی اور خواص کی پسند میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ عوام محاورے یا روز مرّہ کے ہر شعر کو سُن کر سر دھنتے ہیں، اگرچہ اس کا مضمون کیسا ہی مبتذل یا رکیک اور سبک ہو اور اگرچہ محاورہ کیسا ہی بے سلیقگی سے باندھا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں جب انھی اسلوبوں میں وزن کی کھچاوٹ اور قافیوں کا تناسب دیکھتے اور معمولی بات چیت کو شعر کے سانچے میں ڈھلا ہُوا پاتے ہیں تو اُن کو ایک نوع کا تعجب اور تعجب کے ساتھ خوشی ہوتی ہے۔ مگر خواص کی پسند اور تعجب کے لیے صرف روز مرّہ کے سانچے میں ڈھال دینا کافی نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک محض تُک بندی اور محض معمولی بات چیت کو موزوں کر دینا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے، ہاں اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ایک سنجیدہ مضمون روز مرّہ میں کمال خوبی، صفائی اور بے تکلفی سے ادا کیا گیا ہے تو بلا شبہ اُن کو بے انتہا تعجب اور حیرت ہوتی ہے، کیونکہ فنِ شعر میں کوئی بات اس سے زیادہ مُشکل نہیں ہے کہ عمدہ مضمون معمولی بول چال اور روز مرّہ میں پورا ادا ہو جائے۔

جن لوگوں نے روز مرّہ کی پابندی کو سب چیزوں سے مقدم سمجھا ہے ان کے کلام کو بھی جب نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو جا بجا فرو گذاشتیں اور کوتاہیاں نظر آتی ہیں۔ پس جب کوئی شعر باوجود مضمون کی متانت اور سنجیدگی کے روز مرّہ اور محاورے میں بھی پورا اتر جائے تو لا محالہ اس سے ہر صاحبِ ذوق کو تعجب ہوتا ہے۔ مثلاً میر انشاء اللہ خاں اس بات کو کہ افسردگی کے عالم میں خوشی اور عیش و عشرت کی چھیڑ چھاڑ سخت ناگوار گزرتی ہے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سُوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

مثلاً مرزا غالب اتنے بڑے مضمون کو کہ "میں معشوق کے مکان پر پہنچا تو اوّل میں خاموش کھڑا رہا۔ پاسبان نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا۔ جب معشوق کے دیکھنے کا حد سے زیادہ اشتیاق ہوا اور صبر کی طاقت نہ رہی تو پاسبان کے قدموں پر گر پڑا، اب اس نے جانا کہ اس کا مطلب کچھ اَور ہے۔ اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے۔" دو مصرعوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں :-

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا، مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

یا مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں :-

رونے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

قاعدہ ہے کہ جب تک انسان عشق و محبّت کو چھپاتا ہے اس کو ہر ایک بات کا پاس و لحاظ رہتا ہے۔ لیکن جب راز فاش ہو جاتا ہے تو پھر اس کو کسی سے شرم و حجاب نہیں رہتا۔ اس شعر میں یہی مضمون ادا کیا گیا ہے۔ "دھویا جانا" بے حیا اور بے لحاظ ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اور "پاک" آزاد یا شہدے کو کہتے ہیں۔ رونے کے لیے "دھویا جانا" اور دھوئے جانے کے لیے پاک ہونا باوجود اتنی لفظی مناسبتوں اور محاورہ کی نشست اور روزمرہ کی صفائی کے مضمون پورا پورا ادا ہو گیا ہے اور کوئی بات اَن نیچرل نہیں ہے یا مثلاً مومن خاں کہتے ہیں :-

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چُرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

"آنکھیں چرانا" اغماض اور بے توجہی کرنا ہے "کھویا جانا" شرمندہ اور کھسیانا ہونا "پا جانا" سمجھ جانا یا تاڑ جانا، معنی ظاہر ہیں۔ اس شعر میں مضمون بھی نیچرل ہے اور محاورات کی نسبت اور روزمرّہ کی صفائی قابلِ تعریف ہے، اگرچہ اس کا ماٰخذ مرزا غالب کا یہ شعر ہے :-

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق !
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مگر مومن کا بیان زیادہ صفائی سے بندھا ہے۔ الغرض روزمرّہ کی پابندی تمام اصنافِ سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً جہاں تک ہو سکے نہایت ضروری ہے اور محاورہ بھی بشرطیکہ سلیقے سے باندھا جائے شعر کا زیور ہے۔

# مشق

۱۔ "محاورہ" کے اصطلاحی معنی کیا ہیں؟

۲۔ "تین پانچ کرنا" محاورہ ہے۔ کیا "تین" اور "پانچ" کے الفاظ الگ الگ بھی محاورہ کہلا سکتے ہیں؟

۳۔ "روز مرے" اور "محاورے" میں کیا فرق ہے؟ دو دو مثالیں دے کر واضح کیجیے۔

۴۔ درست جواب پر نشان لگائیے۔

(الف) مفرد الفاظ کو روز مرہ یا محاورہ کہا جا سکتا ہے۔ ہاں نہیں

(ب) الفاظ کی وہ ترکیب جو اہلِ زبان استعمال کرتے ہیں روز مرہ ہے۔ ہاں نہیں

(ج) کسی محاورے کے تتبع میں الفاظ کی قیاسی ترکیب سے نئے محاورے بن سکتے ہیں۔ ہاں نہیں

(د) محاورے کا اطلاق ان افعال پر کیا جا سکتا ہے جو اس کے ساتھ مل کر مجازی معنی دیں۔ ہاں نہیں

(ہ) نظم و نثر میں "روز مرہ" کی پابندی کلام کو فصیح بناتی ہے۔ ہاں نہیں

(و) ہر شعر میں محاورے کا استعمال ضروری ہے۔ ہاں نہیں

۵۔ "روز مرہ" کے مطابق درست کیجیے۔

(الف) وہ جوان بیٹے کے مرنے سے درگور ہو گیا۔

(ب) جب نصیب سو گئے تب آنکھیں بیدار ہو گئیں۔

(ج) مجھے آج تک اپنے قلمی دوست سے ملنے کا موقع نہ ملا۔

۶۔ اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

آنکھیں چرانا، بیزار بیٹھنا، کھسیانا ہونا، ہاتھوں کے طوطے اُڑ جانا، زندہ درگور ہونا، پچھاڑیں کھانا۔

۷۔ ان مرکبات میں سے کون کون سے محاورے ہیں؟

آٹھ سات، آٹھ چھ، روز روز، آئے دن، بلا ناغہ، ہر دن، گاڑی سے سامان اتارنا، دل سے اتارنا، دوا کھانا، غم کھانا، دھوکا کھانا، نظروں سے گرنا۔

۸۔ جمع کے واحد اور واحد کے جمع لکھیے۔

محاورات، اعضا، نوع، قافیہ، اصناف، زیور، شعر، اسلوب، ترکیب، افعال، اصطلاح، قیاس، عقائد، تصنیفات۔

# رشتہ ناتا

محمد حسین آزاد

دُنیا میں آدمی کو آدمی سے ایک سلسلہ محبّت کا ہے ۔ ان میں سے جن جن کی طبیعتیں موافق اور عادتیں یکساں ہیں ان میں زیادہ اخلاص اور اتّفاق ہوتا ہے ۔ چونکہ ایک خاندان میں بہ سبب خون شریک ہونے کے اکثر باتیں اور عادتیں مشابہ ہوتی ہیں اس واسطے یہ سلسلہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے ۔ پس اس کو رشتہ یا ناتا کہتے ہیں ۔

رشتہ ایک خدائی پیوند ہے کہ ٹوٹ نہیں سکتا ۔ جو بات کہ خدا کی طرف سے ہو، ہم کو بھی چاہیے کہ اس کی پیروی کریں اور اس کی مضبوطی کو قوت دیں، کیونکہ علاوہ خوشنودیِ خدا کے دُنیا کے کل فوائد اور بہبود، اپنائیت اور یگانگت پر منحصر ہیں ۔ مثلاً اگر ماں باپ کو اپنے بچّے کی محبّت نہ ہو تو اس کی پرورش ممکن نہیں ۔ اسی طرح بھائی، بہن، چچا، پھوپھی وغیرہ مختلف رشتہ دار جو ہر طرح سے ہمارے کاروبار میں معین و مددگار ہوتے ہیں، اگر سب اپنی اپنی جگہ کنارے بیٹھے رہیں تو گزارا دنیا میں نہ ہو سکے ۔ دنیا کی ہر بات میں نزدیکی اور دُوری کے رشتے ہیں ۔ ان کی رعایت اور پابندی کو قانون ادَب کہتے ہیں ۔

ادَب اور تعظیم اور رعایت ان کی دنیا کی بہبود اور کارروائی کے لیے ناگزیر ہے، کیونکہ بدُون اس کے دنیا کا کام بالکل چل نہیں سکتا ۔ اگر ہم کسی کے ساتھ بے ادَبی یا بے توجہی سے پیش آئیں گے تو ہمارا کون ادَب یا وقت پر کام کرے گا ۔

جو تم سے بڑا ہو اُس کو بڑا سمجھو ۔ جو تمھارا بزرگ ہو اُس کی خدمت کرو، کیونکہ جب تک تم اُس کی خدمت نہ کرو گے اُس کے حق سے نہ ادا ہو گے ۔ ایسا کون شخص ہے جو کوئی کمالِ ذاتی خود بخود حاصل کر بیٹھا ہو ۔ جو نعمت یا قدرت دنیا میں حاصل ہوتی ہے بزرگوں کے فیضِ پرورش سے حاصل ہوتی ہے ۔ پس اس کا شکریہ تم کو ادا کرنا واجب ہے تاکہ خدا اس کے ثمر سے تم کو کامیاب کرے ۔

اگر بزرگ تم سے خوش ہوں گے ۔ خدا تمھارا تم سے خوش ہوگا اور زیادہ تر عنایت و انعام فرمائے گا اور دنیا کے فوائد علاوہ اس کے رہے ۔ اس میں سے ایک لطف یہ بھی ہوگا کہ جب تم بڑے ہو گے تو اسی طرح تمھارے

خرد تمھاری خدمت کریں گے۔ پس یہ سلسلہ خدمت گزاری اور بہرہ یابی کا دین و دنیا میں اسی طرح جاری رہے گا جس سے دونوں جہان کی راحت اور نعمت حاصل ہوگی۔

اگر تم اپنے ماں باپ سے خود سر رہے ہو تو عجب نہیں کہ تمھاری اولاد بھی تم سے سرکش رہے۔ اس وقت نہ عقل مندوں کے نزدیک، نہ خدا کی جناب میں کہیں تمھارا دعویٰ پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ تم نے اپنے بزرگوں سے کیا سلوک کیا جو آج اپنے خردوں سے توقع رکھتے ہو۔ یہ مفید قاعدہ دنیا میں اس لیے باندھا گیا ہے کہ جس شخص کو بزرگ کی تعظیم کی عادت ہوگی وہ خدا کی عبادت بھی دل سے کرے گا کیونکہ خدا ایسا مقدس اور بزرگ ہے کہ اس کے سامنے سب کی بزرگی ناچیز محض ہے۔ جو خدا کو بزرگ نہ سمجھے گا وہ اور کسی کو کیا سمجھے گا۔ جو ماں باپ کے حقوقِ پرورش اور محنت کو نہ مانے گا وہ خدا کے حقوقِ نعمت کو کیا پہچانے گا، جو کہ آنکھوں سے بھی غائب ہے اور دنیا لیتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اوّل مرتبہ بزرگی کا دنیا میں خدا کا ہے۔ جس نے تمھیں پیدا کیا اور اس دنیا کو پیدا کیا جو تمھاری ضروریات سے مالا مال ہے۔ اس معبود کی عبادت اور اطاعت بہر حال واجب اور فرضِ عین ہے۔ دوسرا مرتبہ اُن کا ہے جو دنیا میں ذریعہ ہماری پیدائش اور پرورش کا ہیں۔ جن کی بدولت ہم نیستی سے ہستی میں آئے۔ انھوں نے ہمیں پرورش کیا، ہمارے ظاہر و باطن کے بنانے اور سنوارنے میں کوشش کی۔ جتنی اطاعت و تعظیم آدمی سے آدمی کے لیے ہو سکے، اُن کے لیے ہمیں بجا لانی چاہیے۔ اُن کے احکام فقط ہمارے فائدے اور آرام کے لیے ہیں۔ اُن کے خوش کرنے سے خدا خوش ہوتا ہے اور درحقیقت وہ اپنی اطاعت انھی امورات میں چاہتے ہیں جو ہمارے واسطے دین دنیا میں باعثِ راحت و آرام ہیں۔ تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لڑکے اپنے ماں باپ کی اطاعت میں رہے، صاحبِ اقبال ہوتے ہیں اور جو اُن سے برگشتہ رہتے ہیں وہ ہمیشہ بد اقبال اور ذلیل و خوار رہتے ہیں۔ اگر زمانے کے حالات کی طرف غور کریں تو ہزاروں مثالیں اس طرح کی نظر آئیں گی۔ صورت اُن کی اطاعت کی یہ ہے کہ اُن کی خدمت میں حاضر رہو، اُن کی مرضی اور خوشنودی کی جستجو رکھو کہ جس طرح اُن کا جی چاہتا ہے، وہی کام تم سے عمل میں آئے۔ اگر اس طرح نہ معلوم ہو تو عرض کر کے دریافت کرو اور جس طرح حکم دیں عمل کرو۔ اگر اتفاقاً کسی سبب سے انھوں نے ایک کام کہ نہ کہا ہو لیکن تم سمجھتے ہو، پس اس کے سرانجام میں دل سے کوشش کرو۔ لطف یہ ہے کہ ان کے کاروبار کو روبرو لانا درحقیقت اپنے کاموں کو روبرو لانا ہے، کیونکہ ایک دن وہ سب امورات خاص تمھارے ذاتی امورات ہوں گے۔ خدا پرستی اور عبادت، چال چلن، خاندان اور جملہ کاروبار خانگی ان کے موافق رکھو۔ جب سن رسیدہ اور صاحبِ علم اور تجربہ کامل حاصل کرو، اس وقت اس کے دلائل اور برائی بھلائی کو غور کرنا۔ جب تک عقل اور تجربہ خام ہے تب تک خود رائی اور خود سری سے پرہیز رکھو۔ خامی عقل اور ناتجربہ کاری کے سبب سے لڑکپن

ہیں بہت سی باتیں کھیل کود، سیر تماشا اور اکثر وضعیں لباس و پوشاک وغیرہ کی انسان کو بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بزرگ جو منع کرتے ہیں تو لڑکپن کے سبب سے نصیحت ان کی بُری معلوم ہوتی ہے، لیکن جب ہوش آتا ہے تب اس کی خوبیاں اور فوائد سمجھ میں آتے ہیں۔ اس وقت اپنے پہلے خیالات پر انسان نادم ہوتا ہے اور جن بزرگوں کی نصیحت سے اس عمر میں اموراتِ مذکورہ سے محفوظ رہا انھیں اور ان کی روح کو دل سے دعائیں دیتا ہے۔

نشست برخاست میں ان کی تعظیم کرنی چاہیے، انھیں آپ سلام کرنا چاہیے، ان کے سامنے بہت بولنا نہیں چاہیے، ان کو رد کرنا نہیں چاہیے، ان کے سامنے باادب بیٹھنا چاہیے، ان کے آگے نہیں چلنا چاہیے۔ استاد کا رتبہ بھی باپ کے برابر ہے۔ باپ پرورشِ جسمانی کرتا ہے اور استاد پرورشِ روحانی۔ ماں باپ کھلا پلا کر جسم کی پرورش کرتے ہیں، استاد نعمتِ علم سے روح کو پرورش اور تربیت دیتا ہے۔ ماں باپ کے علاقے سے دو سلسلے قرابت کے جاری ہوتے ہیں، یعنی ددھیال اور ننھیال، دادا دادی، نانا نانی کے باب میں اتنا کافی ہے کہ جب وہ ماں باپ کے بزرگ ہیں تو تم کو بھی اُن کا ادب کرنا واجب ہے، کیونکہ بزرگوں کے بزرگ ہیں اور چونکہ ان کا رتبہ اور عقل بہ نسبت ماں باپ کے بھی زیادہ تر پختہ ہے اس لیے ان کی پیروی اور اطاعت زیادہ تر فائدہ مند ہوگی۔ چچا چچی تمھارے ماں باپ کی جگہ ہیں، کیونکہ جس دادا دادی کی اولاد تمھارا باپ ہے، اسی کی اولاد وہ ہیں۔ تمھاری ناموری یا بھلائی سے ان کی بھی ناموری و نیک نامی ہے اور تمھاری بدنامی میں ان کی بھی بدنامی۔ تمھارا اور اس کا خُون شریک ہے، اس واسطے اگر باپ نہ ہوگا تو تمھاری ہر بات پر اس کا خون بھی ویسا ہی جوش کھائے گا جیسا تمھارے باپ کا۔ جیسا کہ اس کو اپنی اولاد سے اُمید فائدے کی ہے، تمھاری پرورش سے بھی وہی اُمید ہے۔ اس واسطے تم کو اس کے باب میں بھی وہی تعظیم کی نظر رکھنی چاہیے جیسی باپ کے ساتھ۔ چچا تمھارا اگر تم سے عمر میں چھوٹا ہو تو بھی اس کی تعظیم کرو، کیونکہ اس کا رشتہ بڑا ہے۔ تمھارے دادا کا بیٹا ہے اور تمھارے باپ کا بھائی۔ ہاں اگر کئی چچا ہوں تو ان میں آپس میں چھوٹے بڑے کا فرق رکھنا ضروری ہے۔

پھوپھی اور پھوپھا کو بھی ماں باپ کے برابر سمجھنا چاہیے۔ مثل مشہور ہے کہ ماں بیٹے دو ذات، پھوپھی بھتیجے ایک ذات۔ باپ اور پھوپھی ایک باپ کی اولاد ہیں، اس لیے ایک ذات ہیں اور ماں کبھی غیر ذات سے بھی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے پھوپھی اکثر بھتیجے کو بہت پیار کرتی ہے۔ پس تم کو بھی ویسا ہی اس کا حق پہچاننا چاہیے۔ تم ان کا حق ادا کرو کہ وہ تمھارا حق (ادا) کریں۔ ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کی خدمت اور تعظیم کرو۔ تمھارا حق ان پر یہ ہے کہ تم پر شفقت بزرگانہ رکھیں۔ جب تمھاری حق شناسی اور نیک نیتی لوگوں پر واضح ہوگی تو اپنے بیگانے میں باعثِ نیک نامی اور موجب اعتبار و عزت ہوگا۔

اسی طرح ماموں ممانی، خالو خالہ سب بزرگ ماں باپ کے برابر ہیں۔ اکثر ماموؤں کو دیکھا جاتا ہے کہ

اپنے بھانجوں کی خودِ پرورش کرتے ہیں اور ایسی محبت ان سے کرتے ہیں کہ وہ ماں باپ کو بھول جاتے ہیں۔ بلکہ جب بچے ضد کرتے ہیں، ماں باپ تنگ ہو کر ان پر خفا ہوتے ہیں۔ لیکن وہ انھیں خفگی اور تنبیہہ سے بچاتے ہیں اور سب ناز ان کے اٹھاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ انھیں بھی یہ امید ہوتی ہوگی کہ جب ہم اس کے ماں باپ کے برابر ہیں، پس اگر ہم ان کی طرح اس کی پرورش کریں گے اور یہ ماں باپ کی سی شفقت ہماری طرف دیکھے گا تو ہمارے بڑھاپے میں ویسی ہی ہماری خدمت کرے گا، جیسی اپنے ماں باپ کی۔

تمھارا ہر ایک بھائی قوتِ بازو ہے، لیکن مثل مشہور ہے کہ بڑا بھائی باپ برابر۔ جتنا تم سے بڑا ہو اتنی ہی اس کی تعظیم بھی زیادہ چاہیے۔ بڑے بھائی بہن تمھاری پرورش میں ماں باپ کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، ان کا حق تم پر واجب ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب ایک بھائی پر کچھ تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے بھائی کا دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ ایک بھائی پر جب سختی ہوتی ہے دوسرا بھائی اپنے تئیں آپ اس میں ڈال دیتا ہے۔ اس خیال سے کہ ہم دونوں مل کر اس تکلیف کو رفع کر دیں گے۔ اگر بچ گئے تو دونوں سے خاندان روشن ہوگا اور ایک دوسرے کا قوت بازو رہے گا۔ مروت اور ہمدردی ہماری جہان میں مشہور رہے گی اور اگر مر گئے تو خیر، جو بھائی کا حال سو اپنا حال۔

بھائی بہنوں میں جو اکثر نا اتفاقی ہوتی ہے اس کے کئی سبب ہیں، اوّل مہربانی ماں باپ کی جو ظاہر میں ایک کے حال پر زیادہ معلوم ہوتی ہے، اس واسطے اور بھائی بہن اس سے رشک کرتے ہیں، مگر یہ ان کی غلط فہمی ہے، کیونکہ درحقیقت ان کی شفقت سب پر برابر ہوتی ہے، لیکن ظاہر میں جو توجہ خاص اس ایک کے حال پر ہے تو کسی خاص مصلحت یا سبب سے ہے یا اس جہت سے کہ وہ چھوٹا ہے، اس کی رعایت یا غور و پرداخت بہ سبب اس کی ناتجربہ کاری کے بہ سبب بڑوں کے واجب ہے، یا یہ کہ وہ ان کی خدمت زیادہ کرتا ہے اور ہر وقت پاس رہتا ہے، یا وہ غریب بے مقدور ہوتا ہے، اس لیے اس پر آنکھ شفقت کی زیادہ پڑتی ہے۔ اور چھوٹوں کو بھی ماں باپ کی محبت پر ناز ہو کر بڑے بھائیوں سے کشیدگی آجاتی ہے۔ پس اس کے لیے چاہیے کہ ہوشمند یا دولت مند بھائی بہن ماں باپ کی چاہتوں پر خودِ نظر توجہ زیادہ کریں اور جس سبب سے ماں باپ ان کی طرف متوجہ ہیں ان پر خودِ شفقت کریں۔ ان کی باتوں کا خودِ سرانجام کریں کہ ماں باپ بھی مہربان ہوں اور وہ بھائی بہن بھی ان کی شفقت دیکھ کر انھیں برابر ماں باپ کے سمجھنے لگیں۔

چھوٹوں کو چاہیے کہ اپنے ماں باپ کی نظرِ عنایت پر نازاں نہ ہوں اور اسی طرح بڑے بھائیوں کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتے رہیں۔ کبھی برخلافی بھائی بہن کی اس سبب سے ہوتی ہے کہ ایک کو دولت یا علم و کمال زیادہ ہوتا ہے، وہ اس کا غرور رکھتا ہے۔ دوسرا بہ سبب رشک کے یا اپنی غلط فہمی سے اس سے کشیدہ ہو جاتا ہے۔

یہ بھی بہت بے وقوفی کی بات ہے۔ دولت مند کو چاہیے سمجھ لے کہ دولت وحشمت یا ہر طرح کا کمال عارضی اور چند روزہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جس ماں باپ کا وہ بیٹا ہے اسی کا یہ ہے مگر اس کو اللہ نے اس لائق کیا کہ سب اس کو معزز جانتے ہیں۔ اس کو چاہیے کہ اپنے بھائی بندوں کو بھی معزز رکھے کہ اس میں اس کی بھی عزت ہے۔ اگر وہ ذلیل و خوار ہوں گے تو اس کی بھی اس میں بے عزتی ہوگی۔ علاوہ اس کے برائی بھلائی چھپتی نہیں۔ اگر یہ ان سے نیک سلوک کرتا رہے گا۔ اس کی قبیلہ پروری سے خویش و بیگانے میں نام نیک مشہور ہوگا۔

جو بھائی مفلس ہیں انھیں چاہیے کہ جس بھائی کو خدا نے عزت دی ہے سب اس کی عزت کریں۔ اس کی دولت اور اس کی مدد سے آپ بھی کمال اور دستِ قدرت حاصل کریں۔ اگر اس کی خدمت کریں گے تو اپنے گھر کا کام کہلائے گا، اگر اَور کی خدمت کریں گے تو اس کے نوکر یا مزدور کہلائیں گے۔ بعض دفعہ بھائی بندوں میں عورتوں کی جہالت اور بے عقلی سے بھی نزاع اور نفاق پڑ جاتا ہے۔ اس کے لیے چاہیے کہ جو کچھ کریں آپ سمجھ کر کریں، فقط ان کے کہنے پر عمل نہ کریں۔ اور ان کو بھی پڑھانے اور سمجھانے سے تربیت اور تہذیب اخلاق کریں کہ یہ خرابی بالکل گھر سے جاتی رہے۔

اتفاق اور یک دلی سے ہر بات آسان اور ہر مطلب حاصل ہو سکتا ہے۔ اتفاق نشانی اقبال کی ہے۔ جس گھرانے میں باہم اتفاق ہے، اس میں دولت کی کثرت ہوتی ہے۔ ہر ایک دوسرے کی مدد سے ترقی کرتا جاتا ہے۔ ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا، بلکہ ان کی جمعیت کو دیکھ کر کوئی ہاتھ بھی نہیں ڈال سکتا۔ ہر شخص کو خیال آتا ہے کہ اس شخص کی لڑائی میں سارے خاندان سے جھگڑا بندھ جائے گا۔ بلکہ غیر لوگ ان کی پناہ ڈھونڈتے ہیں، کیونکہ ان کی رائے میں خطا کم ہوتی ہے۔ جب بہت رائیں جمع ہوتی ہیں تو بات میں چھنتے چھنتے غلطی دور ہو جاتی ہے اور اصل مستحکم ہو جاتی ہے۔ چونکہ خودسری اور خودرائی کا ثمرہ نا اتفاقی ہے اس کا روکنا واجب ہے۔ پس علاج اس کا یہ ہے کہ جو بزرگ اور دیرینہ سال خاندان کے ہوں ان کا ادب کرنا چاہیے، ان کی صلاح اور تجویز کو مقدم سمجھنا چاہیے۔ ان میں سے جو بہت تجربہ کار اور لائق آدمی ہوں چند آدمی بزرگ خاندان قرار دیے جائیں۔ اگرچہ بزرگ کی بزرگی واجب ہے لیکن جب دیکھو کہ ایک شخص باوجود کم سنی کے ہم میں عاقل اور صاحب اقبال ہے تو اس کی مدد اور اطاعت میں کوتاہی نہ کرو کہ خاندان میں سے ایک آدمی کی ترقی گویا سب کی ترقی ہے۔ بعض دفعہ ایک شخص کے اقربائے قریبہ میں کوئی بزرگ نہیں رہتا۔ اس حالت میں چاہیے کہ رشتہ دارانِ دور میں سے کسی بزرگ کا دامن پکڑیں۔ اگر وہ بھی نہ ہو تو ہمسائے یا اپنے بزرگوں کے خویشوں میں سے کسی عقیل اور دانشمند کے سایہ تربیت میں اپنے تئیں لائے اور اس کی صلاحِ آزمودہ کار کے بہ موجب عمل کرے تاکہ مکروہات دُنیا سے محفوظ رہ کر کامیابِ دولت و دین ہو۔

# مشق

۱ - رشتہ ناتا کی معاشرے میں کیا اہمیت ہے ؟

۲ - بھائی بہنوں میں نا اتفاقی کے کیا اسباب ہیں اور انھیں کیسے دور کیا جا سکتا ہے ؟

۳ - اتفاق اور یک دلی کے فوائد بیان کیجیے۔

۴ - تذکیر و تانیث سے کیا مراد ہے ؟ مندرجہ ذیل اسموں میں سے جو مذکر ہیں ان کے مؤنث اور جو مؤنث ہوں ان کے مذکر تحریر کیجیے۔

بندہ ، ہمسایہ ، گوالن ، جوگن ، سنار ، پٹھان ، مینڈک ، مغلانی ، چوہا ، خالہ ۔

۵ - اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

خوشنودی ، یگانگت ، بدون ، بہرہ یابی ، فرضِ عین ، روبراہ لانا ، موجبِ اعتبار و عزت ، غور و پرداخت ، خودرائی ، صاحبِ اقبال ، مکروہاتِ دنیا ، حق شناسی ، نزاع و نفاق ۔

۶ - جمع کے واحد اور واحد کے جمع لکھیے ۔

فوائد ، عنایت ، قاعدہ ، حقوق ، احکام ، امورات ، اسناد ، تجربہ ۔

۷ - اس سبق سے پانچ محاورے تلاش کر کے لکھیے ۔

۸ - مرکباتِ توصیفی کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں ۔ اس سبق سے مرکباتِ توصیفی تلاش کر کے لکھیے ۔

۹ - درج ذیل کے سابقے لاحقے اس طرح بدلیے کہ ان کے متضاد بن جائیں۔

بہرہ ور ، عقل مند ، بدنامی ، فائدہ مند ، نیک نیتی ، دولت مند ۔

۱۰ - ایسے مرکبات سبق سے تلاش کر کے لکھیے جو متضاد الفاظ سے بنے ہوں ۔

جیسے سیاہ و سفید۔

خواجہ حسن نظامی

یہ بھنبھناتا ہُوا ننھا سا پرندہ ہے آپ کو بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کردی ہے۔ ہندو، مُسلمان عیسائی، یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلے کے لیے مُہمّیں تیار ہوتی ہیں۔ جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں۔ مگر مچھّروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ شکست پر شکست ہوتی چلی جاتی ہے اور مچھّروں کا لشکر بڑھا چلا آتا ہے۔

اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بھُنگے پر قابو نہیں پا سکتا۔ طرح طرح کے مصالحے بھی بناتا ہے کہ ان کی بُو سے مچھّر بھاگ جائیں۔ لیکن مچھّر اپنی یورش سے باز نہیں آتے۔ آتے ہیں اور نعرے لگاتے ہُوئے آتے ہیں۔ بے چارا آدم زاد حیران رہ جاتا ہے اور کسی طرح ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

امیر، غریب، ادنیٰ، اعلیٰ، بچّے بوڑھے، عورت مرد، کوئی اس کے وار سے محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کے پاس رہنے والے جانوروں کو بھی ان کے ہاتھ سے ایذا ہے۔ مچھّر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں۔ ان جانوروں نے میرے دشمن کی اطاعت کی ہے تو میں ان کو بھی مزا چکھاؤں گا۔

آدمیوں نے مچھّروں کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق مچھروں پر الزام رکھ کر لوگوں میں ان کے خلاف جوش پیدا کرنا چاہتا ہے مگر مچھّر اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

طاعون نے گڑبڑ مچائی تو انسان نے کہا کہ طاعون مچھّر اور پسّو کے ذریعے سے پھیلتا ہے۔ ان کو فنا کردیا جائے تو یہ ہولناک وبا دور ہو جائے گی۔ ملیریا پھیلا تو اس کا الزام بھی مچھّر پر عائد ہُوا۔ اس سرے سے اس سرے تک کالے گورے آدمی غل مچانے لگے کہ مچھروں کو مٹا دو۔ مچھروں کو کچل ڈالو۔ مچھروں کو نہس نہس کردو اور ایسی تدبیریں نکالیں جن سے مچھّروں کی نسل ہی منقطع ہو جائے۔

مچھّر بھی یہ سب باتیں دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا اور رات کو ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھے ہُوئے "پانیر"

کو آکر دیکھتا اور اپنی برائی کے حروف پر بیٹھ کر اس پر خون کی ننھی ننھی بوندیں ڈال جاتا جو انسان کے جسم سے یا ڈاکٹر صاحب کے جسم سے چوس کر لایا تھا۔ گویا اپنے فائدے کی تحریر سے انسان کی ان تحریروں پر شوخیانہ ریمارکس لکھ جاتا کہ میاں تم میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے۔ کوڑے کرکٹ، میل کچیل سے پیدا ہوتا ہے اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے اور بزدلی تو دیکھو اس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ ہم سو جاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا، بے خبر کے چرکے لگانا مردانگی نہیں انتہا درجے کی کمینگی ہے۔ صورت تو دیکھو کالا بھتنا، لمبے لمبے پاؤں، بے ڈول چہرہ، اس شان و شوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے خوش وضع پیاری ادا کی دشمنی، بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں۔

مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب ہمت ہے تو مقابلہ کیجیے۔ ذات صفات نہ دیکھیے۔ ہیں کالا سہی، بد رونق سہی، نیچ ذات اور کمینہ سہی مگر یہ تو کہیے کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیونکر آپ کا ناک میں دم کرتا ہوں۔

یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری ہیں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں۔ تم اپنی عادت کے موافق سراسر ناانصافی کرتے ہو۔ حضرت ہیں تو کان میں آکر الٹی میٹم دے دیتا ہوں کہ ہوشیار ہو جاؤ، اب حملہ ہوتا ہے۔ تم ہی غافل رہو تو میرا کیا زمانہ خود فیصلہ کر دے گا کہ میدان جنگ میں کالا بھتنا، لمبے لمبے پاؤں والا جنرل فتح یاب ہوتا ہے یا گورا چٹا آن بان والا۔

میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے اس پردۂ دنیا پر کیا کیا جوہر دکھائے ہیں۔ اپنے بھائی نمرود کا قصہ بھول گئے جو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ کس نے اس کا غرور توڑا؟ کون اس پر غالب آیا۔ کس کے سبب اس کی خدائی خاک میں ملی۔ اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے ہی کسی بھائی سے دریافت کیجیے یا مجھ سے سنیے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکش کا خاتمہ کیا تھا۔

اور تم تو ناحق بگڑتے ہو اور خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کیے لیتے ہو۔ میں تمہارا مخالف نہیں ہوں۔ اگر تم کو یقین نہ آئے تو اپنے کسی شب بیدار صوفی بھائی سے دریافت کر لو، دیکھو وہ میری شان ہیں کیا کہے گا۔ کل ایک شاہ صاحب عالم ذوق ہیں اپنے ایک مرید سے فرما رہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بے چارہ خلوت خانہ میں رہتا ہے رات کو جو خدا کی یاد کا وقت ہے باہر نکلتا ہے اور پھر تمام شب تسبیح و تقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے۔ آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں تو اس کو ان پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر اپنے مالک کے دیے ہوئے اس سہانے خاموش وقت کی قدر کرے اور حمد و شکر کے گیت گائے۔ اس لیے پہلے ان کے کان میں جا کر کہتا ہے اٹھو میاں اٹھو، جاگو، جاگنے کا وقت ہے۔ سونے کا اور ہمیشہ سونے کا وقت

ابھی نہیں آیا۔ جب آئے گا تو بے فکر ہو کر سونا۔ اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا موقع ہے۔ مگر انسان اس سریلی نصیحت کی پروا نہیں کرتا اور سوتا رہتا ہے۔ تو مجبُور ہو کر غصہ میں آجاتا ہے اور اس کے چہرے اور ہاتھ پاؤں پر ڈنک مارتا ہے۔ بے پروا انسان آنکھیں بند کیے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور بے ہوشی میں بدن کو کھجا کر پھر سو جاتا ہے اور جب دن کو بیدار ہوتا ہے تو بے چارے مچھر کو صلواتیں سناتا ہے کہ رات بھر سونے نہیں دیا۔ کوئی اس دروغ گو سے پوچھے کہ جناب عالی! کے سیکنڈ جاگے تھے جو ساری رات جاگتے رہنے کا شکوہ ہو رہا ہے۔

شاہ صاحب کی زبان سے یہ عارفانہ کلمات سُن کر میرے دل کو بھی تسلّی ہُوئی کہ غنیمت ہے ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجُود ہیں بلکہ میں دل میں شرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہوجاتا ہے کہ شاہ صاحب مصلّے پر بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں اور میں اُن کے پیروں کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت ایسی اچھی اور نیک رائے دیں اور میں ان کو تکلیف دوں۔ اگرچہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کاٹتا تھوڑی ہے، چومتا ہے اور ان بزرگوں کے قدم چومنے ہی کے قابل ہوتے ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اس سے میری ندامت دور نہیں ہوتی اور اب تک میرے دل میں اس کا افسوس باقی ہے۔

(سیپارۂ دل از خواجہ حسن نظامی)

# مشق

۱۔ اس تحریر میں انسان کی طرف سے مچھر پر کیا کیا الزامات عائد کیے گئے ہیں؟ ان کا خلاصہ لکھیے۔

۲۔ مچھر کی زبان سے انسانوں کے عائد کردہ الزامات کا کیا جواب دیا گیا ہے؟ مختصر بیان کیجیے۔

۳۔ سبق کے پہلے اور دوسرے پیراگراف کو سادہ زبان میں اس طرح لکھیے کہ اس میں استعمال ہونے والے مشکل الفاظ اور محاورات کا مفہوم بھی واضح ہو جائے۔

۴۔ نمرود کے جس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے بارے میں مزید حقائق معلوم کر کے لکھیے۔

۵۔ درج ذیل تراکیب اور محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

قدم چومنا، صلواتیں سنانا، خلوت خانہ، ناحق بگڑنا، کھری کھری سنانا، الزام عائد کرنا، تہس نہس کر دینا، ڈیل ڈول، کسر نہ اٹھا رکھنا۔

۶۔ مرکبات توصیفی کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس سبق سے مرکبات توصیفی تلاش کر کے لکھیے۔

۷۔ درج ذیل کے سابقے، لاحقے، اس طرح بدلیے کہ ان کے متضاد بن جائیں۔

بے خبر، بے عقلی، بد رونق، ہوشیار، دروغ گو، خوش وضع، بے فکر، بروقت۔

# وزن کی تبدیلیاں

حبیبُ اللہ خان

زمین پر ہماری زندگی اس قسم کی ہے کہ ہمیں اپنے وزن کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا اور نہ ہم کبھی اس بارے میں غور کرتے ہیں سوائے اس صورت کے کہ بیمار ہو کر کمزور ہو جائیں یا غیر معمولی طور پر موٹے ہو جائیں اور ڈاکٹر ہمیں مشورہ دیں کہ صحت کے لیے مناسب تبدیلی ضروری ہے ۔ اگر ہمارے راستہ میں کوئی گڑھا یا نالی آجائے اور ہمیں اسے کودنے کے سوا چارہ نہ رہے تو شاید اس وقت ہمیں یہ احساس پیدا ہو کہ ہمارا جسم ہلکا یا بھاری ہے۔ ایسی استثنائی صورتوں کے علاوہ عام طور پر ہمیں اپنے وزن کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

لیکن امر واقع یہ ہے کہ ہر شخص جو زمین پر رہتا ہے اس کا وزن ہوتا ہے، جو بڑی حد تک یکساں رہتا ہے اور اس میں صحت کے ساتھ معمولی سا فرق پڑتا رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ یک دم وزن نصف ہو جائے یا دو گنا ہو جائے ، لیکن خلائی سفر میں یہ یکسانیت باقی نہیں رہے گی۔ سفر کے آغاز کے وقت وہ تین یا چار گنا ہو جائے گا اور پھر اچانک اس میں اس قدر کمی ہو جائے گی کہ انسان محسوس کرے گا کہ وہ بے وزن ہو گیا ہے ۔ جب صورت حال یہ ہو گی تو اس جگہ قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے جسم کے وزن کا فائدہ کیا ہے اور اس کا ہماری زِندگی پر کیا اثر پڑتا ہے ؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں کششِ ثقل اور وزن پر غور کرنا ہوگا۔ جب سے زمین وجود میں آئی ہے وہ تمام چیزوں کو ایک اَن دیکھی قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچے رکھتی ہے ، جسے ہم قوتِ تجاذب یا کششِ ثقل کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ہزاروں لاکھوں سال سے بغیر کسی وقفہ کے یہ اشیاء پر اثر انداز ہے اور ان کو زمین سے باہر نکلنے سے روکے ہُوئے ہے ۔ ہمارا وزن درحقیقت اسی قوت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے ۔ جب ہم کھڑے ہوتے ہیں تو یہ قوت ہمارے پاؤں کے نیچے عمل کر کے تلوؤں کو زمین سے لگائے رکھتی ہے ۔ یہ نہ صرف تلوؤں پر اثر کر رہی ہے بلکہ سارے جسم پر اثر کر رہی ہے ۔ سر کا دباؤ گردن اور دھڑ پر ہوتا ہے اور سر دھڑ کا دباؤ ٹانگوں پر۔ یہ سب دباؤ مل کر مجموعی رنگ میں وزن کہلاتا ہے ۔

زمین کی یہ کشش ہمارے جسموں سے ایسی وابستہ ہے کہ ایک لحظہ کے لیے بھی وہ جدا نہیں ہوتی اور ہمارے تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ یہ کسی وقت غائب بھی ہو سکتی ہے، لیکن اب علمی اور تجرباتی رنگ میں ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ بعض حالتوں میں واقعی وہ غائب ہو سکتی ہے اور ہمارا جسم بے وزن ہو سکتا ہے۔ چونکہ انسان کو زمین پر اس کا کبھی تجربہ نہیں ہوا اور نہ عام پرواز ہی میں کبھی اس حالت سے سابقہ پڑا ہے، اس لیے بے وزنی کی کیفیت اس کے لیے بہت عجیب ہوتی ہے۔

ہمارا ہر روز کا مشاہدہ ہے کہ کوئی شے ہوا میں بغیر سہارے کے معلّق نہیں رہتی، لیکن اگر کبھی ہمیں یہ نظارہ نظر آئے کہ پانی ہوا میں اِدھر اُدھر اڑتا پھر رہا ہے، ہماری کتابیں اور کرسیاں ہوا میں معلّق ہیں اور بلّی کتے فرش پر کھڑے ہونے کی بجائے کمرہ کے وسط میں تیرتے پھر رہے ہیں تو یقیناً یہ کیفیت ہمارے لیے غیر معمولی اور بہت عجیب وغریب ہوگی۔ صفر ثقل یا بے وزنی کی حالت میں ایسی ہی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ مسئلہ بڑا دلچسپ اور جاذبِ توجہ ہے۔

بے وزنی کا تصور درحقیقت ان جدید انکشافات میں سے ہے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ہوئے۔ بے وزنی کی اس نرالی کیفیت کا احساس اس طرح پیدا ہوا کہ جس زمانہ میں اتحادیوں کے بمبار، لڑاکا طیّاروں کی حفاظت میں جرمنی پر بمباری کر رہے تھے، جرمن ہوا بازوں کو ان پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ کرنے کی ایک نئی ترکیب سوجھی۔ ان کے لڑاکا طیارے بہت بلندی پر چلے جاتے اور وہاں سے اچانک غوطہ لگا کر اس طرح ابھرتے کہ اتحادیوں کے بمبار ان کی زد میں ہوتے۔ ان پر حملہ کرنے کے بعد دشمن کے لڑاکا طیاروں کی آتش بازی سے بچنے کے لیے وہ فوراً دوبارہ غوطہ لگاتے اور پھر ابھر کر صاف بچ نکلتے۔ جرمن طیارہ رانوں نے تجربتاً محسوس کیا کہ جب وہ تیزی سے غوطہ لگاتے تو ان کے جسم پر بوجھ عام حالت کے مقابلہ میں بڑھ جاتا۔ لیکن جب وہ ابھر کر اوپر آتے تو اس وقت ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اور ان کا طیارہ بے وزن ہو گئے ہیں۔ وزن کی اس تبدیلی کے علاوہ انھوں نے یہ مشاہدہ کیا کہ بے وزنی کی حالت میں ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے اور جب وہ اس حالت میں دشمن کے بمباروں پر گولیاں چلاتے ہیں تو اکثر ان کا نشانہ خطا جاتا ہے۔

ان طیارہ رانوں نے اس نرالی کیفیت سے پریشان اور خوف زدہ ہو کر ڈاکٹر ہینز وان ڈرنگ شوفین[۱] سے اس کا ذکر کیا جو اس وقت برلن میں ہوائیہ کے طبّی شعبہ میں پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر موصوف نے خود پرواز کر کے اس کیفیت کا مزہ چکھا اور یہ بھی مشاہدہ کیا کہ اس حال میں ٹانگوں میں ضُعف پیدا ہوتا ہے اور جسم کی حرکت کچھ بے ربط اور غیر محفوظ ہو جاتی ہے۔

جنگ کے معاً بعد دو اور جرمن سائنس دانوں ڈاکٹر آٹو گور[۲] اور ڈاکٹر ہینز ہیبر[۳] نے خیال کیا کہ یہ کیفیت

---

۱:- Dr. Heinz Von Diringshofen ۲:- Dr. Ottogaur ۳:- Dr. Heinz Haber

مستقبل کے خلائی سفر میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی اس لیے اس کا اچھی طرح مطالعہ نہایت ضروری ہے۔
انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ ایسی کیفیت ہے جو خلا باز کی صحت اور کار کردگی پر گہرا اثر ڈال سکتی ہے۔
بہت ممکن ہے اس کے باعث اعصابی نظام بُری طرح متاثر ہو جائے اور عملِ تنفس، غذا کا انہضام، فضلہ کا اخراج، قلب کی حرکت اور دوسرے افعال جو غیر ارادی طور پر انسان کرتا رہتا ہے ان میں خلل واقع ہو۔ وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچے کہ اس کیفیت سے بینائی، توازن، سمت کی شناخت اور قوتِ لامسہ وغیرہ پر بھی ضرور بُرا اثر پڑے گا۔
اس کے علاوہ انھوں نے اس امر کا اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ بے وزنی کی حالت میں کان کے اندرونی حصے جنھیں آٹولتھ[۴] کہتے ہیں اور جو عام حالت میں سمت کے تعین میں مدد دیتے ہیں، دماغ کو ایسی اطلاعات بھجوائیں گے جو صحیح فیصلہ میں ممد ہونے کی بجائے دماغی انتشار کا موجب ہوں گی، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس حالت میں جسم میں خون کا دوران قائم نہ رہے اور موت واقع ہو جائے۔ ان تمام خطرات کے پیشِ نظر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اس مسئلہ کی اچھی طرح چھان بین کرنی چاہیے۔

تجرباتی کام شروع کرنے سے قبل عمومی رنگ میں یہ محسوس کیا گیا کہ اوّل یہ معلوم کیا جائے کہ کتنی بلندی پر خلائی کیفیات شروع ہو جاتی ہیں۔ جب اس نقطہ نظر سے ہوا کا جائزہ لیا گیا تو پتہ لگا کہ بارہ میل سے زائد بلندی پر ہوا کی افادیت تقریباً ختم ہو جاتی ہے اور خلائی کیفیات کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اگرچہ مکمل خلا تو ۱۲۰ میل سے لے کر ۶۰۰ میل کی بلندی پر پیدا ہوتا ہے تاہم عام اغراض کے لیے اب بارہ میل سے زائد بلندی کو خلا کے مساوی قرار دے دیا گیا ہے۔

بے وزنی یا صفر ثقل کا مطالعہ کرنے کے لیے سب سے پہلے ہم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ثقل سے کیا مراد ہے اور اس کا وزن سے کیا تعلق ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ زمین کے آر پار اس کے وسط میں سے گزرتی ہوئی ایک سرنگ بنی ہے اور اس کا منہ ایک تختے سے بند ہے جس پر ہم کھڑے ہیں۔ اگر اچانک وہ تختہ ہٹا دیا جائے تو ہم اس سرنگ میں گرتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ اس کے وسط میں جو زمین کا مرکز ہے جا کر ہم ٹھہر جائیں گے۔
زمین کے مرکز میں چیزوں کے کھینچنے کی جو قوت پائی جاتی ہے اس کو قوتِ تجاذب یا کششِ ثقل کہتے ہیں۔

جب ہم زمین پر بیٹھے یا کھڑے ہوتے ہیں تو ہمارا جسم زمین کے مرکز کی طرف گرنا چاہتا ہے، لیکن زمین کی سطح تختے کی طرح ہم کو گرنے سے روکے رکھتی ہے۔ اس رکاوٹ کے باعث ہمارا جسم زمین کی سطح پر دباؤ ڈالتا ہے۔
اس دباؤ کو وزن کہتے ہیں۔ وزن اس سہارے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو ہمیں زمین کے مرکز کی طرف حرکت کرنے یا گرنے سے روکتا ہے۔ خواہ وہ سہارا فرش ہو یا کرسی ہو یا زمین کی سطح ہو۔ اگر ہم سہارے کے نیچے ایک سپرنگ رکھ دیں تو وہ وزن کی وجہ سے نیچے کی طرف دب جائے گا۔ جس قدر وزن زیادہ ہوگا اسی قدر سپرنگ نیچے کی طرف

---

۴:- Otolith.

زیادہ دبے گا۔ اگر ہم سپرنگ سمیت زمین کے مرکز کی طرف گرنا شروع کردیں اور کوئی چیز راستہ میں مزاحم نہ ہو تو سپرنگ پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا اور وہ دبے گا نہیں۔ اس حالت میں گویا ہمارا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ بے وزنی پیدا کرنے کی سب سے آسان ترکیب یہی ہے کہ زمین کے مرکز کی طرف آزادانہ گرا جائے۔ جب راکٹوں کے ذریعے کوئی چیز اوپر پھینکی جاتی ہے تو ایک خاص بلندی پر پہنچ کر وہ آزادانہ نیچے گرنے لگتی ہے اور اسی وقت وہ بے وزن ہوجاتی ہے۔ بے وزنی کے مطالعہ کے لیے یہ اچھا طریق ہے، لیکن یہ وقفہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ تفصیلی مطالعہ ممکن نہیں۔

وزن کا تعلق حرکت اور زمین کے مرکز سے دُوری سے بھی ہے۔ جب کوئی جسم زمین پر ساکن ہو تو اس کے وزن کو ایک ثقل سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اس کا عام وزن ہوتا ہے جو صرف سکون کی حالت میں برقرار رہتا ہے۔ جب اِنسان اچھلتا کودتا ہے یا کسی سواری پر بیٹھ کر سفر شروع کرتا ہے تو اس کا وزن بدلتا رہتا ہے۔ کبھی وہ عام وزن سے زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ جب کوئی جہاز ران غوطہ لگاتا ہے تو اس کے وزن میں تین ثقل تک اضافہ ہوجاتا ہے یعنی اگر اس کا عام وزن ایک من ہو تو غوطہ لگانے کی حالت میں وہ تین من تک پہنچ جاتا ہے لیکن جب وہ غوطہ لگانے کے بعد اوپر کو ابھرتا ہے تو وزن کم ہو کر بالآخر بے وزنی کی حالت پیدا ہوجاتی ہے۔

جو چیز وزن میں تبدیلی پیدا کرتی ہے وہ مادے کی خاصیّتِ جمود ہے۔ اس خاصیّت کی وجہ سے ساکن چیز حرکت کا مقابلہ کرتی ہے اور اس میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس جو چیز حرکت میں ہو وہ اس حرکت کو ایک خاص سمت میں جاری رکھنا چاہتی ہے۔ اگر حرکت میں تبدیلی کی جائے یا اس کو بالکل بند کردیا جائے یا سمت میں ہی تبدیلی کی جائے تو جمود کی خاصیّت اس تبدیلی کا مقابلہ کرتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نئی قوّت (جمودی قوت) اس تبدیلی کو روکنے کے لیے نمودار ہوگئی ہے اور اس نے اس کے وزن کو بدل دیا ہے، مثلاً جب ہم موٹر کو اچانک حرکت میں لے آئیں یا چلتی موٹر کو ایک دم روک لیں یا کسی موڑ پر اچانک گاڑی کا رُخ پھیر دیں تو ہمیں زور سے دھکا لگتا ہے۔ یہ دھکا اس بات کی علامت ہے کہ نئی قوت (قوّتِ جمود) نمودار ہوگئی ہے جو تبدیلی کی مزاحم ہے۔ جس وقت اس نئی قوت کا عمل کششِ ثقل کے مخالف ہوتا ہے تو وزن میں کمی پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور جس وقت جہاز ران غوطہ لگا کر اوپر اٹھتا ہے اور اس کا انجن پورے زور سے کام کر رہا ہوتا ہے تو زمین طیارہ کو نیچے کھینچتی ہے اور چلتے ہُوئے طیارہ کی قوت جمود اسے برابر اوپر کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ جب یہ دونوں قوتیں مساوی ہوجاتی ہیں تو جسم بے وزن ہوجاتا ہے۔

بے وزنی پیدا کرنے کی تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جسم کو زمین کے مرکز کے گرد تیزی سے گھمایا جائے۔ جب ہم ایک پتھر کو ڈوری سے باندھ کر اپنے جسم کے گرد گھماتے ہیں تو اس پر تین قوتیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔ ایک مرکز جُو(۵) قوت ہوتی ہے جو اسے مرکز (یعنی ہاتھ) کی طرف کھینچ رہی ہوتی ہے۔ دوسری مرکز گریز(۶) قوت ہوتی ہے جو اس کو

---

۵: Centripetel force ۶: Centrifugal force

مرکز (یعنی ہاتھ) سے دور لے جانا چاہتی ہے۔ جب یہ دونوں قوتیں متوازن اور مساوی ہوتی ہیں تو پتھر ایک دائرہ کی شکل میں گھومنے لگتا ہے۔ تیسری قوت کشش ثقل ہے جو ہاتھ کی قوت کمزور پڑ جانے پر پتھر کو نیچے گرا دیتی ہے۔

اگر ہم راکٹ کے ذریعے کسی جسم کو بہت بلندی تک پہنچا کر زمین کے متوازی دھکا لگا دیں تو قوتِ جمود اس کو حرکت میں رکھنا چاہے گی اور کشش ثقل اسے نیچے کھینچ رہی ہوگی۔ اگر جسم کو اتنی قوت سے دھکا لگا دیا جائے کہ اس کی مرکز گریز قوت کشش ثقل کے برابر ہو جائے تو وہ جسم بے وزن ہو جائے گا اور ہمیشہ زمین کے گرد گھومتا رہے گا۔ ہمارے مصنوعی سیارے بے وزنی کی حالت میں ہی زمین کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ روسی خلا باز میجر گاگرن نے جب زمین کا ایک چکر لگایا تو وہ اس گردش کے وقت بے وزنی کی حالت میں رہا۔ اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لیے گردش کی رفتار کم از کم اٹھارہ ہزار میل فی گھنٹہ ہونی چاہیے۔

اس امر کا مطالعہ کرنے کے لیے کہ فعلیاتی رنگ میں بے وزنی کا انسان پر کیا اثر ہوتا ہے اور وہ اس کیفیت کو کس حد تک برداشت کر سکتا ہے، باقاعدہ تحقیقات کا آغاز دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ہیڈل برگ (جرمنی) کے ایرو میڈیکل سنٹر میں ایک مذاکرہ ہوا جس میں موضوع بحث یہ تھا کہ بے وزنی کی حالت میں انسان کن کیفیات سے گزرتا ہے۔ امریکہ میں اس مسئلہ کی تحقیقات کا آغاز ۱۹۵۱ء میں ہوا۔

مشکل یہ ہے کہ اس کیفیت کا زمین پر پیدا کرنا آسان نہیں۔ اس لیے جہاں یہ مسئلہ بہت دلچسپ اور جاذبِ توجہ ہے وہاں اس کا مطالعہ بڑا مشکل ہے۔ ابتدا میں جانوروں پر بے وزنی کی کیفیت کا مطالعہ شروع کیا گیا اور ان کو وی ٹو⁷ اور ایروبی⁸ قسم کے راکٹوں کے ذریعے ۷۰ میل کی بلندی تک پہنچایا گیا۔ ان تجربات کے دوران بے وزنی کی کیفیت تین منٹ تک قائم رہی۔ راکٹ میں ایک ڈبہ ایسا رکھا جاتا تھا جس میں جانوروں کو بٹھا دیا جاتا تھا اور اس میں ہوا کا دباؤ اور موسمی حرارت ایسا رکھا جاتا تھا جو عام طور پر زمین پر ہوتا ہے تاکہ اس ماحول میں جانوروں کو کوئی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ ان کے جسم کے ساتھ نازک آلے لگا دیے جاتے تھے جن سے دل کی حرکت، خون کا دباؤ اور تنفس کی کیفیت وغیرہ معلوم ہوتی رہتی تھی اور سب اطلاعات ٹیلی میٹری کے ذریعہ زمینی سٹیشنوں تک پہنچتی رہتی تھیں۔ بعض دفعہ اس ڈبہ میں فلم کیمرہ بھی لگا دیا جاتا تھا تاکہ ان کی حرکات اور جذبات کو ریکارڈ کیا جا سکے۔

ایک تجربہ کے دوران میں جانوروں کے ڈبہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان میں دو سفید چوہے رکھ دیے گئے۔ ایک چوہے کو ڈبہ کے فرش پر پہنچنے کے لیے ایک رکاوٹ پر سے کود کر جانا پڑتا تھا، لیکن دوسرے حصہ میں ایسے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ جو چوہا رکاوٹ والے حصے میں رکھا گیا تھا اس کے کان کے اندرونی حصے نکال دیے گئے تھے، جس کی وجہ سے اسے سمت کی شناخت باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن دوسرا چوہا بالکل ٹھیک تھا۔ جس وقت

---

۷: V-2 راکٹ ۸: Aerobee

بے وزنی کی کیفیت پیدا ہُوئی تو تندرست چوہا ہَوا میں معلّق ہوگیا اور گھبراہٹ و بے چینی سے زور زور سے پاؤں مارنے لگا، کیوں کہ بے وزنی میں سمت کا احساس اچانک غائب ہوگیا اور اس کا دماغ یہ نہ بتلا سکا کہ کیا ہو رہا ہے اور سیدھی سمت کون سی ہے۔ اس کے برعکس دوسرے چوہے میں گھبراہٹ پیدا نہیں ہُوئی کیوں کہ وہ سمت کا احساس پہلے ہی کھو چکا تھا اور اس کیفیت کا عادی ہوگیا تھا۔ تھوڑی دیر آزادانہ گرنے کے بعد راکٹ کا پیراشوٹ کھل گیا اور وہ بہت آہستہ آہستہ گرنے لگا۔ اب بے وزنی کی کیفیت ختم ہوگئی تھی اس لیے دونوں چوہوں کی حرکات معمول کے مطابق ہوگئیں اور وہ عام چوہوں کی طرح دوڑنے بھاگنے لگے۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر جیراتھ وہل (۹) نے ایک جیٹ طیارہ میں پرواز کے دوران اپنے ساتھ ایک بلّی بھی لے لی۔ جب طیّارہ میں غوطہ لگا کر ابھرنے سے بے وزنی کی کیفیت پیدا ہُوئی تو اس نے بلّی کو پاؤں سے پکڑ کر اُلٹا اٹھا لیا اور پھر چھوڑ دیا۔ عام حالت میں اگر بلّی کو اس طرح الٹا کر چھوڑا جائے تو وہ ہوا میں ہی پلٹ جاتی ہے اور ہمیشہ سیدھی پاؤں کے بل گرتی ہے۔ اگر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور الٹا کر کے گرایا جائے تب بھی وہ سیدھی ہو جاتی ہے، لیکن بے وزنی کی حالت میں وہ ہوا میں ہی معلّق رہی اور جب بے وزنی کی حالت ختم ہوگئی تب بھی الٹی ہی گری۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بے وزنی کی حالت میں اپنا توازن کھو بیٹھی اور گرنے کے بعد بھی کافی دیر تک گھبرائی ہُوئی اور خوف زدہ رہی۔

بحیثیت مجموعی جانوروں کے تجربات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بے وزنی کی وجہ سے کوئی ایسی تکلیف نہیں ہوتی جو ناقابلِ برداشت ہو۔ رُوسی سائنس دانوں نے اپنے دوسرے سپتنک میں ایک کتیا رکھ دی جو چھ دن تک، بے وزنی کی حالت میں رہی، لیکن اس پر کوئی خاص مُضر اثر نہیں ہُوا۔ جانوروں پر کیے ہُوئے تجربات بے شک مفید ہیں اور ان سے اہم نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں، لیکن ان کی افادیت ایک حد تک ہے۔ جانوروں اور انسانوں کے ردِعمل اور طرزِ عمل میں بہر حال فرق ہے۔ انسان میں اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت جانوروں سے کہیں زیادہ ہے اور وہ مشق اور تجربہ سے بہت جلد نئے حالات کا عادی ہو جاتا ہے۔

جانوروں پر تجربات کے ساتھ ساتھ جیٹ طیاروں میں انسانی پرواز کے تجربے بھی شروع کر دیے گئے۔ جیٹ جہاز ران جب ایک خاص زاویہ پر غوطہ لگا کر اوپر اٹھتے ہیں تو ان کو بے وزنی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کیفیت صرف چالیس پینتالیس سیکنڈ تک رہتی ہے تاہم مطالعہ کے لیے یہ بھی غنیمت ہے۔ ۱۹۵۱ء میں امریکہ کے ہوائی طبّی مرکز (۱۰) میں ڈاکٹر بیلنگر (۱۱) نے پرواز کے دوران متعدد افراد پر بے وزنی کے اثرات کا مطالعہ کیا۔ جن افراد کو اس غرض کے لیے منتخب کیا گیا تھا ان کو اپنی جگہ پر پٹیوں کے ذریعے اچھی طرح باندھ دیا گیا تھا تاکہ سمت کی

---

۹:- Dr. Jerathwohl ۱۰:- Aeromedical Centre ۱۱:- Dr. Bellinger

شناخت برقرار رہے۔ اس کے بعد پندرہ بیس سیکنڈ تک انھیں بے وزنی کی حالت میں رکھا گیا۔ اس تجربہ سے معلوم ہُوا کہ ان کی دل کی حرکت، خون کے دباؤ اور تنفس پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ البتہ اگر وہ اپنی جگہ پر بندھے ہُوئے نہ ہوتے تو شاید انھیں سمت کا کچھ پتا نہ لگتا اور وہ گھبراہٹ یا بے چینی محسوس کرتے۔

## مشق

۱- وزن کس قوت کی وجہ سے ہے؟
۲- صفر ثقل یا بے وزنی کی حالت میں کیا کیفیت ہوتی ہے؟
۳- انسانی جسم پر بے وزنی کی کیفیت کے دوران کیا کیا اثرات ہو سکتے ہیں اور ان کا کیا تدارک کیا گیا ہے؟
۴- کشش ثقل کیا ہے اور کیوں ہے؟
۵- مادے کی کون سی خاصیت وزن میں تبدیلی پیدا کرتی ہے اور کیسے؟
۶- بے وزنی کی حالت میں متوقع کیفیات معلوم کرنے کے لیے کون کون سے تجربات کیے گئے اور ان سے کیا نتائج نکلے؟
۷- بے وزنی کی کیفیت میں زمین کے گرد گردش کرتے رہنے کے لیے رفتار کیا ہونی چاہیے؟
۸- مندرجہ ذیل واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیے۔
افراد، طبی مرکز، اثرات، تجربات، حالات، حرکت، تکلیف، کیفیت، اطلاع، تعلق، اغراض، خطرہ۔
۹- درج ذیل کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کے معنی واضح ہو جائیں۔
تنفس، معلق، متوازن، مزاحم، نظام انہضام، خلل، ضعف، اَن دیکھی، استثنائی صُورت، امر واقع۔
۱۰- سبق سے مرکباتِ توصیفی تلاش کر کے لکھیے۔
۱۱- سابقے لاحقے بدل کر ان کے متضاد الفاظ بنائیے۔
بے وزن، غیر معمولی، خوف زدہ، غیر محفوظ، بے ربط، غیر ارادی۔

# سندھ میں علم و فضل

مولانا غلام رسول مہر

سندھ کی سرزمین کی بہت سی امتیازی خصوصیات جنوبی ایشیا کے اکثر لوگوں کی نظروں سے مستور و متواری رہیں یہ حالت دیکھ کر بے اختیار عباسیانِ بغداد اور اُمویانِ اَندلس کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اَندلس میں جو یگانہ روزگار علماء پیدا ہوئے ان کے ناموں سے بھی مشرقی اقطار کے اکثر اہلِ علم آشنا نہ ہو سکے، حالانکہ اُن کی تصانیف اس قابل تھیں کہ انھیں سر آنکھوں پر جگہ دی جاتی۔ خلافتِ بغداد کے دورِ آخر میں جن علماء نے زندگیاں بسر کیں ان میں سے ہر ایک کے نہیں تو کم از کم اکابر کے نام ہر شخص کی زبان پر ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان علماء کی کتابیں مشرقی اقطار میں مسلسل رائج و متداول رہیں، لیکن اندلسی علماء کی کتابیں صدیوں تک یہاں پہنچنے ہی نہ پائیں۔

سندھ وہ خطہ ہے جہاں مسلمانوں کے قدم سب سے پہلے پہنچے اور انھوں نے جا بجا درس گاہیں قائم کر لیں۔ اس کے بعد صدیوں تک باہر سے اہلِ علم و فضل کی آمد جاری رہی۔ وہ سب پہلے سندھ ہی پہنچتے تھے اور ان میں سے اکثر وہیں بیٹھ جاتے تھے۔ کتب خانوں کا جیسا اچھا ذوق سندھ میں تھا کسی دوسرے حصے میں اس کی مثالیں غالباً بہت کم ملیں گی۔ (مدت ہوئی کہ زمانے کے اطوار بدل گئے) جن علوم کی تحصیل کو ہمارے ہاں معیارِ علم و فضل مانا جاتا تھا ان کی قدر و قیمت باقی نہ رہی۔ کتب خانے برباد ہو گئے لیکن آج بھی کوئی شخص طول و عرض سندھ میں پھر نکلے تو اکثر غیر معروف مقامات میں اسے نہایت نادر کتابوں کے ذخیرے مل جائیں گے۔

کلہوڑوں کی حکومت کا باقاعدہ آغاز میاں یار محمد خان سے ہوا جو بحیثیت مجموعی اٹھارہ انیس سال سلطنتِ مغلیہ کے ایک ناظم کی حیثیت میں کام کرتے رہے اور اس مدت میں سے کم و بیش آدھی مختلف کشمکشوں میں گزری۔ ظاہر ہے اس حالت میں فراہمی کتب کی طرف دل جمعی سے توجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ میاں نور خان جانشین بنے تو ان کے سامنے نہایت اہم ملکی تنظیمات تھیں اور مسلسل چھوٹی بڑی لڑائیاں جاری رہیں۔

بایں ہمہ نادر شاہ کی آمد سے پیشتر میاں صاحب کے پاس ایک اچھا کتب خانہ جمع ہو گیا تھا۔ نادر نے جہاں زر و سیم اور جواہرات سمیٹے، وہاں اس علمی دولت کو بھی اٹھا کر لے گیا۔

کپتان ہملٹن ۱۶۹۹ء میں ٹھٹھ آیا تھا وہ لکھتا ہے:

"شہر ٹھٹھ دینیات، لسانیات اور سیاست کی تدریس و تعلیم کے سلسلے میں خاصی شہرت کا مالک ہے۔ وہاں چارسو کالج ہیں جن میں نونہالوں کو ان علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔"

کالج سے مراد یقیناً ویسے کالج نہیں جیسے ہمارے زمانے میں موجود ہیں۔ ان سے مراد بہر حال درس گاہیں ہیں۔ لیکن پرانے زمانے میں ایسی ہی درس گاہیں ہر جگہ قائم تھیں۔ یہی ہمارے یہاں نشر و اشاعتِ علوم کا ذریعہ تھیں۔ اکثر درس گاہوں کو حکومت کی طرف سے امداد ملتی تھی، بعض ایسی بھی تھیں جو مختلف علماء کرام کی سعی و ہمت کی بدولت چل رہی تھیں۔ ہمارے ملک میں جن اصحاب نے علمی لحاظ سے درجہ شہرت و امتیاز حاصل کیا وہ انھی درس گاہوں سے اٹھے تھے۔ جب وہ نظم و نسقِ ملک پر متوجہ ہوئے تو ابوالفضل فیضی اور سعداللہ خان علامی بنے، جن کی نظیریں دوسرے ملکوں میں بھی بہت کم ملیں گی۔

ٹھٹھ کی آبادی اس زمانے میں کم و بیش ڈھائی لاکھ تھی۔ اس آبادی میں چھوٹی بڑی چارسو درس گاہوں کا وجود بہر حال علمی ذوق کے تداولِ عام کی دستاویز ہے خواہ انھیں مکتبوں ہی کے پیمانے کی درس گاہیں فرض کر لیا جائے۔ مکتبوں میں بھی وہ تمام کتابیں پڑھائی جاتی تھیں جو مختلف علوم میں بنیاد و اساس کی حیثیت رکھتی تھیں اور جنھیں اساتذہ سے پڑھ لینے کے بعد لوگ اپنی ہمّتِ مطالعہ اور مزاولت سے عالم بن جاتے تھے۔

شیخ بکھری اپنی بے مثال کتاب "ذخیرۃ الخوانین" (ہملٹن سے تقریباً ربع صدی پیشتر مرتب کی تھی) میں لکھتا ہے:

"ٹھٹھ کے اولیاء، علماء اور شعراء کی گنتی محال ہے۔ یہاں صرف و نحو، دینیات اور شاعری عام ہے۔ مختصر یہ کہ ٹھٹھ کو عراق ثانی سمجھنا چاہیے۔"

شیخ فرید اور ہملٹن کی شہادتیں مغلوں کے زمانے سے متعلق ہیں۔ کلہوڑوں کی حکومت کا آغاز شیخ فرید سے کم و بیش ستائیس برس اور ہملٹن سے قریباً دو برس بعد ہوا، لیکن ان شہادتوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس علمی پس منظر میں کلہوڑے برسرِ کار آئے اور اگر اہلِ علم کی سرپرستی سے کاملاً بے پروائی بھی اختیار کر لیتے تو یہ علمی پس منظر قرن دو قرن میں تو زوال پذیر نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ہمارے سامنے ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ کلہوڑوں نے حتی الامکان تمام اصنافِ علوم کی سرپرستی فرمائی اور ان میں سے اکثر خود اصحابِ علم و فضل تھے۔ بعض نے مختلف علوم میں مقامِ امتیاز حاصل کیا۔

کلہوڑوں کے عہد میں جتنے اہلِ علم و فضل گزرے ان سب کے نام اور حالات معلوم نہ ہو سکے۔ میر علی شیر قانع نے "تحفۃ الکرام" اور "مقالات الشعراء" میں صرف اُن ممتاز ادباء کا ذکر کیا ہے جن کے نام

اس کو معلوم ہو سکے۔ ذیل میں صرف بعض اکابر کے حالات درج ہیں، جن کے بارے میں بالیقین معلوم ہو سکا کہ وہ کلہوڑوں کے عہد میں گزرے یا کلہوڑہ حکومت نے ان کی سرپرستی کی۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کلہوڑوں کی سرگزشت میاں آدم شاہ سے شروع ہوتی ہے جو جلال الدین محمدؐ اکبر بادشاہ کے زمانے میں تھا۔ اگر اس وقت سے علماء کے حالات بیان کیے جائیں تو یہ در اصل مغلوں کے عہد کی داستان بن جائے گی۔ بنا بریں مناسب یہی ہے کہ سلسلہ اٹھارویں صدی کی ابتداء سے کیا جائے، جب میاں یار محمدؐ خان کو سبّی و گنجابہ کی نظامت ملی اور میاں محمدؐ خان کے عہد سے زیادہ تر علماء و ادباء کے نام فراہم کیے جائیں، اس لیے کہ پورا سندھ میاں صاحب ممدوح ہی کے عہد میں کلہوڑوں کے زیر حکومت آیا۔

اکابر علم و فضل کے حالات اختصاراً بیان کرنے سے پہلے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے جو غالباً اکثر اصحاب کے نزدیک تعجب انگیز ہوگی اور وہ یہ کہ سندھ کا ہر خطہ اور ہر پرگنہ ہر دور میں دماغی و روحانی فضائل کے حاملوں کا مرجع بنا رہا۔ یہ دولت بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں محدود نہ تھی۔ ٹھٹھہ بے شک بہت بڑا شہر تھا۔ صدیوں تمدن، تہذیب، صنعت و حرفت اور تجارت کا شہرۂ آفاق مرکز رہا۔ وہاں اگر ہملٹن کے زمانے میں چار سو درس گاہیں تھیں تو اس سے یہ اثر قبول نہ کرنا چاہیے کہ سندھ کے باقی خطے اہل علم و فضل یا درسگاہوں سے خالی تھے۔ میر علی شیر قانع نے "تحفۃ الکرام" میں اکابر کے حالات انتہائی اختصار سے لکھے ہیں اور ترتیب ایسی رکھی ہے کہ سرسری نظر سے دیکھا جائے تو پورا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ بیان اہل سندھ کے فضائل کا کتنا بدیع اور نادر مرقع ہے۔ مندرجہ ذیل فہرست میں ان مقامات کے نام درج ہیں جہاں کے اکابر کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ اس فہرست کو پیش نظر رکھ کر غور فرمائیے کہ علم کس درجہ عام تھا۔ شہر ہی نہیں بلکہ قریے بھی اس بے بہا ثروت سے معمور تھے۔

بکھر، سکھر، روہڑی، الور، سبّی، کھوڑ، سیوستان، دشت براں، پکا کاتیار، بوبکاں، بالا کنڈی، بھٹ، بھانوٹ، جانوٹ، جھیجہ، اڑپور، کھہرو، بھٹ جوہری، نصرپور، گجرات، کاتیار، الھم کوٹ، چاچک، ونگھ، دلھار، اپلای، ٹھری، بلڑی، گلیوٹ، ککرالا، منعلوی، نیرون کوٹ (حیدر آباد) اکن پور، بھٹہ، شال، دھونڈہ ہنگورہ کوہ گنجہ، دندی، سونڑا، کولاب، کنجر، سامرئی، ہنگورجہ، در بیلا، روپساہ، پٹ باراں، لاہری بندر، ٹھٹھہ مواضعات، کنارا سانگڑا، شکارپور، بھرالو، کاہان، سن۔ یہ سرسری فہرست ہے، ممکن ہے بعض نام رہ گئے ہوں، لیکن یہ فہرست بھی علم کی ہمہ گیری کی ایک روشن دستاویز ہے۔

# مشق

۱ - سندھ کے علم وفضل کے بارے میں ہملٹن کی کیا رائے ہے ؟

۲ - اس مضمون سے پرانے زمانے میں سندھ میں علم وفضل پر کیا روشنی پڑتی ہے ۔

۳ - سندھ میں علم وفضل کا پرانا معیار کیوں باقی نہیں رہا ؟

۴ - محاورہ کسے کہتے ہیں ؟ مندرجہ ذیل میں صحیح محاوروں کے سامنے صحیح لکھیے اور غلط محاوروں کو صحیح طور پر لکھیے ۔

آنکھوں کا پانی ڈھلنا ، بال کی کھال کھینچنا ، لڑکی کیا ہے آفت کی پر کالی ہے ، لکڑی کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی، عصمت گھوڑے بیچ کر سوتی ہے ۔

۵ - جمع کے واحد اور واحد کے جمع لکھیے ۔

خصوصیات ، تصانیف ، علما ، اطوار ، مقامات ، کتب ، تنظیمات ، اکابر ، جواہر ، اصحاب ، اساتذہ ، اصناف ، مثال فضائل ، موقع ، دستاویز ۔

۶ - اپنے جملوں میں استعمال کیجیے ۔

مستور ، امتیازی ، سر آنکھوں پر جگہ دینا ، دل جمعی ، پس منظر ، سرگزشت ، مرجع ، مرقع ، معمور ، ثروت ۔

**نوٹ:** مرکز وسائل برائے انسداد منشیات نے منشیات کے عالمی دن کے موقع پر "دوست نشے سے باز رہو" کے عنوان سے ایک مقابلہ مضمون نویسی کا انعقاد کیا تھا۔ جس میں اس مضمون نے تیسرا انعام حاصل کیا۔ اس مضمون کو کسی ترمیم و تحریف کے بغیر شائع کیا جا رہا ہے۔

# دوست نشے سے باز رہو

یوں تو دل و دماغ کی تسکین کے لیے انسان ہزارہا اشیا سے مستفید ہوتا ہے اور اپنے اذہان و قلوب کو راحت پہنچاتا ہے کیوں کہ اس دنیا میں کوئی بھی شے بے کار اور مہلک پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کا صحیح اور غلط استعمال ہی اس کی افادیت اور نقصان کو واضح کرتا ہے۔ اس بنا پر انسان اپنی ذہانت و فراست سے زہر کو بھی تریاق میں تبدیل کرنے کا سلیقہ و گُر رکھتا ہے لیکن کچھ اشیا ہوتی ہیں جن کو جس پہلو سے بھی دیکھیں آدمی کے لیے کارگر و مفید ثابت نہیں ہو سکتیں جیسے بھنگ، چرس، افیون، کوکین اور ہیروئن وغیرہ۔

دیگر مذاہب کے برعکس ہمارے دین اسلام میں نشہ کرنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ کہا گیا ہے "کل مسکر خمر و کل خمر حرام"۔ یعنی نشہ دینے والی شے حرام ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو بھی چیز انسانی ذہن و قلب پر غفلت، تاریکی اور بے حسی کی چادر اوڑھ دے اور انسان کو مخبوط الحواس کر دے، حرام و ممنوع ہے۔

ٹیکنیکی اور طبعی اعتبار سے ہر چیز کی اپنی ایک اصل ہوتی ہے۔ انسانی جسم بھی ایک مشین کی طرح کام کرتا ہے، جیسے دوسری مشینیں اپنے اپنے کام سر انجام دیتی ہیں۔ اگر ایک مشین میں تیل کی بجائے پانی ڈال دیا جائے تو وہ کام کرنا چھوڑ دے گی حتیٰ کہ اس کے پرزے بھی زنگ آلود ہو جائیں گے اور ساری مشین ناکارہ ہو کر رہ جائے گی۔

پس ظاہر ہوا کہ ہر چھوٹی چیز کا اپنا ایک مقام اور اپنی ایک ضرورت ہوتی ہے اور اس کو اس کی ضرورت کے مطابق ہی غذا فراہم کرنی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں تو انجام خطرناک ہوگا۔ بعینہٖ انسانی جسم کی بھی اپنی ضروریات اور لوازمات ہوتے ہیں۔ اس سے بڑی بے وقوفی کیا ہے کہ ہم اس کی نشو و نما کے لیے مہلک نشہ آور اشیا کا استعمال کریں۔

اگر آدمی نشہ آور اشیا استعمال کرتا ہے تو اس کا ذہن، حواس، اعصابی نظام، حتیٰ کہ نظام انہضام بھی معطل ہو جاتا ہے اور خرابی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ توان کے خلاف نبرد آزما بھی ہوتا ہے اور ان کے خاتمے کے لیے ہر طرح کے اقدامات بھی کرتا ہے۔

پہلے دور میں انسان سانپ، شیر، جنات اور چڑیلوں وغیرہ سے ڈرتا تھا۔ اس کا اعتقاد تھا کہ یہ چیزیں اس کو

نقصان پہنچائیں گی۔ اس دور کو ہم شکار کا عہد کہہ سکتے ہیں۔ انسانی معاشرہ نے ایک قدم اور بڑھایا اور انسان ذہنی طور پر ان بلاؤں کے خوف سے کافی آزاد ہو کر زرعی عہد میں داخل ہو گیا۔ زرعی دور میں جنگلی درندوں اور بلاؤں سے خوف کے برعکس اسے زیادہ تر صاف پانی، ہوا اور غذا کی ضرورت تھی۔

اس کرۂ ارض پر انسان کے دوست و دشمن ہزاروں ہیں، لیکن انسان اپنے تحفظ و بقا کے لیے آقاؤں اور بادشاہوں کے جبر و استبداد سے لرزہ براندام ہونے لگا۔ ظلِ الٰہی کا عتاب اس کی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوتا۔

انسان کا ذہن ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا چند قدم اور آگے بڑھا۔ اس نے آزادی و مساوات کا نعرہ بلند کیا۔ کاخِ امراء کے در و دیوار کو ہلانے کا عزم کیا، تمام بلاؤں کے جبر و استبداد کا مقابلہ کیا تو اسے سکھ کا سانس نصیب ہوا۔

انسان اپنی آواز بلند کرنے کے قابل ہو گیا تو اسے صنعتی دور میں آزادی و مساوات جیسے وہ زریں حقوق ملے جو دراصل اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ اس عہد میں اس کو ظلِ الٰہی کے جبر و استبداد کے آگے بھیگی بلی کا کردار تو نہ ادا کرنا پڑا مگر جدید سائنس کے مہلک ہتھیاروں نے اس کو ایک ایسے خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا ہے جس کا علاج آج تک اس کے پاس نہیں ہے۔ ایک طرف اس کو ان گنت سہولیات بھی میسر آئیں مگر دوسری طرف اسے ایسے مہلک کیمیاوی ہتھیاروں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس کا تدارک اس کے پاس نہیں ہے۔ ان مہلک ہتھیاروں کے استعمال سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس نے دفعتاً زندگی سے ہاتھ دھو ڈالے اور اس کو ان کے استعمال کے بعد دیر تک جینا نہیں پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس جدید سائنسی عہد نے اس کو ایک ایسا انمول تحفہ بھی عطا کر دیا جو اس کے لیے ان تمام تینوں ادوار کے خطرات سے زیادہ مہلک ثابت ہُوا جو منشیات کے نام سے معروف ہے۔

منشیات ایک ایسی لعنت ہے جو آرام سے جینے دیتی ہے اور نہ ہی مرنے دیتی ہے۔ جب ایک بار اس کی لت پڑ جائے تو بقول شاعر:

چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اس کی محبّت میں گرفتار ہو کر آدمی دنیا و آخرت سے فارغ ہو جاتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ اس کے لیے جان لیوا ہے، اس سے دست کش نہیں ہوتا۔ وہ اس کے استعمال کرنے سے نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے بلکہ ایک نہایت جان کنی کے عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور گویا ہوتا ہے:

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے!

بہ نظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ نشے کے عادی انسان سے زیادہ اس کائنات میں کوئی دوسرا اتنا ذلیل، اتنا گھٹیا، اتنا بے غیرت، اتنا بے حیا، اتنا بے وقوف اور اتنا بد بخت نہیں ہوتا۔ ذلیل اس لیے کہ وہ

کسی بھی گھٹیا اور اخلاق سوز حرکت کرنے سے باز نہیں آتا۔ بے غیرت و بے حیا اس لیے کہ وہ اپنی عادت کو پورا کرنے کے لیے اپنی غیرت اور شرم و حیاء تک کو بیچ دیتا ہے ۔ بے وقوف اس لیے کہ ہمیشہ کی ٹھوکریں اس کا مقدر ہو جاتی ہیں لیکن وہ ان سے کبھی سبق حاصل نہیں کر پاتا۔ بد بخت اس لیے کہ نہ صرف یہ دنیاوی زندگی اور اس کی ساری کائنات بلکہ اُخروی زندگی بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

نشے کا عادی انسان خود ہی موافق ہواؤں کا رُخ مخالف سمت کو موڑ دیتا ہے اور:

"زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے"

کے مصداق اپنے پاؤں پر خود آپ کلھاڑی مار لیتا ہے اور دنیا کے بدبخت و بدترین انسانوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اپنا ہی دشمن نہیں ہوتا بلکہ سارے معاشرے پر اس کے منفی اور انتہائی غلط و نقصان دہ اثرات پڑتے ہیں۔ شادی شدہ ہے تو اس کی آل و اولاد تباہی کے گڑھے میں جا پڑتی ہے۔ معاشی طور پر اس کا دیوالیہ نکل جاتا ہے۔ اس کی جیب میں زہر کھانے کے لیے بھی پیسہ نہیں ہوتا چولھے میں آگ نہ گھڑے میں پانی کی ضرب المثل کے مصداق اپنی ذات مصلوب کر کے بے یار و مددگار ہو کر رہ جاتا ہے۔ بار بار ٹھوکریں کھانے اور ملامت و تضحیک کے باوجود رو بہ اصلاح نہیں ہوتا۔ انسان کی جب کسی نشہ آور چیز، ہیروئن وغیرہ سے دوستی ہو جاتی ہے تو آسمان کو بھی اس کے ساتھ عداوت کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، بقول غالب:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہُوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

علیٰ ہٰذالقیاس تلوار سے مغلوب کیے ہوئے ملک پر دوبارہ پہرہ بٹھا کر اس کی حفاظت کرنا پڑتی ہے مگر ہیروئن و افیون سے غلام بنائی ہوئی قوم پر پہرہ بھی نہیں بٹھانا پڑتا ہے اس لیے کہ اس کے دورِ غلامی میں احساسِ غلامی پیدا ہی نہیں ہوتا۔

آج کے دور میں وہی قوم زیادہ تر غلامی کا شکار ہو سکتی ہے جس کے عوام بادہ نوشی، ہیروئن فروشی اور افیون خوری میں آگے ہیں۔ سائنس نے نوعِ انسان کو ایک طرف جتنی سہولیات فراہم کی ہیں، دوسری طرف اتنی ہی مہلک ادویات بھی مہیا کی ہیں جن کا شکار ہو کر انسان ناقابلِ علاج امراض میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ "غم دیا ہے جس نے مداوا بھی وہی کرے گا" تو ایسا کہنا درست نہیں۔ منشیات کے تدارک کے لیے نہ صرف معالجوں اور سائنس دانوں کو دن رات کام کرنا ہوگا، بلکہ ہر شعبہ زندگی سے منسلک تمام افراد کو اپنا اخلاقی، مذہبی و معاشرتی فریضہ بنا کر منشیات کا قلع قمع کرنے کے لیے کمر ہمّت باندھنی ہے۔ جب تک قوم و ملت کا ہر فرد انسانیت کی فلاح کی خاطر اس کے خلاف بر سرِ پیکار نہیں ہوگا، اس بیماری کا رفع

ہونا بعید از قیاس ہے، کیوں کہ:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارہ

اے دوست نشے سے باز رہو!

کیوں کہ اگر تجھے یہ معلوم ہو کہ جس شے سے تُو نے دوستی کی ہے وہ کبھی کسی کی دوست نہیں بلکہ اس کے غم نے کتنوں کی جان لی اور کتنوں کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا، تو تو اس کے نشہ پر موت کو ترجیح دے گا۔ تجھے اگر علم ہو کہ اس کے نشے نے کتنوں کے گھر لُوٹے، کتنوں کی حسرتوں کو خاک میں ملایا، کتنوں کی زندگیاں اجیرن کیں، کتنوں کو بے اختیار بنایا، کتنے سماج میں باؤلے کُتّے سے بھی کم تر سمجھے گئے۔ کتنوں کو معاشرے کا ناسور سمجھا گیا اور کتنوں کی دنیا و آخرت تباہ کی، تو اپنی زندگی میں نشہ کرنا تو کیا اس کا نام تک سُننا گوارا نہ کرے۔

مگر معلوم نہیں کہ تیری عقل پر کیوں پردہ پڑا ہُوا ہے؟ تُو اپنے ہاتھوں خودِ دنیا کا بدبخت و بدترین شخص بننے پر کیوں تُلا ہُوا ہے۔ نشے کا جو گھونٹ تُو نے پینا ہے وہ نوعِ انسانیت کا خون ہے۔ تُو کش لگا کر جو دھواں نکالتا ہے وہ انسانیت کی آہیں ہیں۔ تُو خود نشہ پی کر مدہوش ہو کر ساری کائنات کے انسانوں کو اس کی گہری نیند میں سلانا چاہتا ہے۔ تجھے یہ تمام حقائق معلوم ہو جائیں تو بعید نہیں کہ تو اس کا نام لینا بھی گوارا نہ کرے۔

تجھے میں تلقین نہیں کرتا، سچ سچ بتاتا ہوں کہ نشہ کرنے سے نہ صرف تو معاشی بحران کا شکار ہو گا بلکہ ہر قسم کا انحطاط و تنزل تیرے مقدر کا حصہ بن جائے گا۔ ایسا کرنے سے تُو دماغی توازن کھو بیٹھے گا، تیرے اعصاب شکستہ ہو جائیں گے۔ بُرے بھلے میں تمیز نہیں رہے گی۔ حواسِ خمسہ مفلوج ہو کر رہ جائیں گے۔ خرد کو جنوں اور جنوں کو خرد کہنا تیرے حسن کرشمہ ساز کا وطیرہ بن جائے گا۔ نفسیاتی الجھنیں ایک چادر کی صُورت میں تجھ پر پڑ جائیں گی۔ خلفشار و غلط فہمی، فراست و ذہانت کی جگہ ڈیرے ڈال دیں گے۔ بے تکلفی و بے حیائی، جھوٹ اور مکر و فریب تیری شخصیت کے نمایاں پہلو بن جائیں گے۔ تعلیم سے بے بہرہ، روزگار سے نالاں، اخلاقی گراوٹ میں یکتا اور کمزوری و ناتوانی میں خودِ اپنی ذات کے لیے سراپا درد بن کر ننگِ خاندان، ننگِ ذات، ننگِ انسانیت کے القابات کا ہار گلے میں ڈالے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گا۔ اپنا انجام خودِ دیکھ لے، خودِ اس کا مقابلہ کر لے، خودِ اس کا فیصلہ کر لے۔

چرس، افیون، بھنگ اور ہیروئن اب صرف کنڈکٹروں، ڈرائیوروں یا عام ٹھیوں پر کام کرنے والوں کا شغل نہیں رہا بلکہ اس میں مبتلا شرفا بھی ہو چکے ہیں۔ یہ ایڈز کا مرض سب کو لگ چکا ہے۔ ڈرائیور، کنڈکٹر یا عام ان پڑھ آدمی اس کا شکار صرف غلط ماحول کی وجہ سے ہوتا ہے اور اسے اس کے نقصانات سے بھی آگہی نہیں ہوتی۔ لٰہذا ضروری ہے کہ ایسے حضرات پر کڑی نگاہ رکھی جائے جو صرف ایک کش لگا کر ہزاروں انسانوں کی

زندگیوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ آج کے دور کا مسافر جب سفر کرتا ہے تو اس کو عدم تحفظ کا احساس بہت زیادہ ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی زندگی و موت ڈرائیور کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اس لیے عدلیہ و انتظامیہ کو چاہیے کہ ان کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کریں۔ قانون کا نفاذ بھی ہو اور اس پر سختی سے عمل در آمد بھی، تب کہیں جاکر لاتوں کے یہ بھوت بات مانیں گے۔

مذکورہ بالا طبقہ کے علاوہ پڑھے لکھے دولت مند حضرات بھی نشہ کرتے ہیں۔ وہ اپنا معیار برقرار رکھنے کے لیے معمولی نشہ کے برعکس مہنگی اشیا کو مرغوب سمجھتے ہیں۔ اپنے آپ کو جدت پسند، آزاد خیال ثابت کرنے کے لیے مست ملنگ بننا چاہتے ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے وہ ایک طرح کے Snobbish کہلوانا چاہتے ہیں۔ احساسِ تنہائی، بھری دنیا میں اپنی کم مائیگی کا احساس، بہت کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہ ہونے کا تصور ان کو الگ تھلگ دنیا میں گم سم رہنے پر اکساتا ہے جس میں فریبِ نفس کا زیادہ عمل دخل ہوتا ہے۔ اس طرح یہ اہلِ ثروت تمام مذہبی و معاشرتی حدود کو پھلانگ کر ان مہلک نشہ آور اشیا کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ جان بوجھ کر مصیبت کا جوا اپنے گلے میں ڈالتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے آپ کو روشن خیال یا ترقی یافتہ بھی کہلواتے ہیں۔

مگر ایسا نہیں۔

ان دو طبقوں کو چھوڑ کر ملت و قوم کا سرمایہ طلبہ حضرات فی زمانہ تناسب کے لحاظ سے ہیروئن یا دیگر نشہ آور اشیا میں زیادہ مبتلا ہیں۔ طلبا بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ یہ ہماری ماحول سے ہی مستعار لیتے ہیں۔ وہ یا تو بڑوں کی تقلید کرتے ہیں یا احساسِ ذمہ داری نہ ہونے سے اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا پھر اسے فیشن پرستی کے طور پر اپناتے ہیں اور بالآخر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

سب کے لیے بالخصوص اور طلبا کے لیے بالعموم اگر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ مکتبہ و مدرسہ ایک مقدس ادارہ ہے۔ اس کے قواعد و ضوابط چاروں طرف درست ہونا چاہییں۔ پھر طلبا ایک مخصوص چار دیواری کے اندر رہتے ہیں، یعنی اس مخصوص ماحول میں اس کی کڑی نگہداشت کی جائے۔ نظم و ضبط کی سختی سے پابندی کی جائے۔ تمام اساتذہ منشیات بلکہ دوسری مہلک اخلاقی بیماریوں کے متعلق لیکچر دیں اور منشیات زدہ طلبا کی اصلاح کریں۔ اس کے بغیر یہ بات ممکن نہیں کہ کالج اور یونیورسٹی کا ماحول درست ہو جائے۔ اس کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ کی تعیناتی ضروری ہے اور یہ کہ اساتذہ کے کورسز میں ان جدید مسائل پر مبنی مضامین شامل کیے جائیں۔ اس کے علاوہ بچوں کے کورسز میں بھی منشیات کے خلاف مضامین شامل ہوں تب جاکر کہیں یہ روبہ اصلاح ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ یونیورسٹی اور کالجوں کا ماحول ہر قسم کے تخریبی عناصر سے پاک ہونا چاہیے کیوں کہ یہ کلاشنکوف کلچر، سیاسی دھڑے بازیوں، انتقام کی سیاست اور مخالفت برائے مخالفت، غلط ہم صحبتی کے رجحانات،

منشیات نوشی اور بُرے اعمال کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ اس بنا پر مکتب و مدرسہ کو جنت کا نمونہ بنانے کے لیے ہر پہلو پر غور و فکر کرنے کی آج ہمیں ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ بچوں اور طلبہ کو غلط کام کرنے کی ترغیب دینے والے سماجی عناصر کا بھی جائزہ لیا جائے۔ سگریٹ جیسی عام چیز کو بھی آدابِ مجلس کے خلاف سمجھا جائے۔ جب تک عدلیہ و انتظامیہ قانون کے نفاذ اور اس پر عمل درآمد پر زور نہیں دے گی ہماری سوسائٹی روبہ اصلاح نہیں ہو سکتی اس لیے آج تمام علما و مقررین حضرات کو روایتی فرقہ وارانہ آگ بھڑکانے کے برعکس دورِ جدید کی ان اخلاقی، روحانی اور جسمانی بیماریوں پر خطبے اور تقاریر کرنی چاہیے۔ اسلام جمود کا شکار نہیں صرف سمجھنے والے کم ہیں۔ ہر پڑھے لکھے آدمی کو ان بیماریوں اور بری عادات کے اثرات سے آشنا ہونا چاہیے۔

سب سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ قوم کو دینِ اسلام کی طرف راغب کیا جائے کیوں کہ مذہب ہر برائی کا مقابلہ قوت و فراست سے بہتر طور پر کر سکتا ہے۔

## مشق

۱۔ نشہ کرنے کے بارے میں دین اسلام میں کیا حکم ہے؟

۲۔ منشیات کے استعمال سے انسانی جسم پر کیا کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

۳۔ منشیات کا استعمال انسان کی شخصیت اور کردار پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے؟

۴۔ منشیات کے استعمال سے معاشرے پر بحیثیت مجموعی کیا اثر ہوتا ہے؟

۵۔ اپنے جملوں میں استعمال کیجیے کہ معنی واضح ہو جائیں۔ قلع قمع کرنا، وطیرہ، خلفشار، مرغوب۔

۶۔ آپ نے کوئی منشیات کا عادی شخص دیکھا ہو تو اس کا خاکہ لکھیے۔

۷۔ جمع کے واحد اور واحد کے جمع لکھیے:

مذاہب، اذہان، قلوب، جنات، لوازمات، القابات، اساتذہ، رجحان۔

# سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

پطرس بخاری

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہم چاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی! امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں، آپ سحر خیز ہیں، ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے۔

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مُکّا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالمِ خواب ہے ابھی سے کیا فکر، جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کلینڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا، تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوگی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں ------ اچھا ---------- اچھا ------------ تھینک یو! ------- جاگ گیا ہوں ---------- بہت اچھا ---------- نوازش ہے، آنجناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا! کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مُردے کو جلا رہے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰؑ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے، زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں داغا کرتے تھے؟ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اُٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے۔ پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے اس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب بلب جلایا اور اُن کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں سوچا کہ آج پتا چلائیں گے یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سُنی تھیں ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا

لگ گیا کہ آج کہیں سُورج گرہن نہ ہو۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی۔

"لالہ جی!۔۔۔۔۔۔ لالہ جی!۔۔۔۔۔"

جواب آیا، "ہوں"۔

میں نے کہا "آج کیا بات ہے، کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟"

کہنے لگے، "تو اور کیا تین بجے ہی سُورج نکل آئے؟" تین بجے کا نام سُن کر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا "کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں؟"

کہنے لگے "تین تو۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ کچھ سات۔۔۔۔۔۔ ساڑھے سات۔۔۔۔۔ منٹ۔۔۔۔۔ اُوپر تین تین۔۔۔۔۔۔"

میں نے کہا "ارے کم بخت، خدائی فوجدار! بدتمیز کہیں کے، میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا یا یہ کہا تھا سرے سے سونے ہی نہ دینا۔ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے۔ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اٹھ سکے ہوتے تو اس وقت دادا جان کے منظورِ نظر نہ ہوتے۔ ابے احمق کہیں کے تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ امیر زادے ہیں۔ کوئی مذاق ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ لاحول ولاقوۃ۔۔۔۔۔۔"

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد و شدد کو خیر باد کہہ دُوں، لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہم نے لے رکھا ہے؛ ہمیں اپنے کام سے غرض ہے، لمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہُوئے پھر سو گئے اور پھر حسبِ معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے، بارہ بجے تک منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔ شام کو واپس ہاسٹل وارد ہُوئے۔ جوشِ شباب تو ہے ہی، اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔۔۔۔۔۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی، طبیعت بھی ذرا مچلی ہُوئی تھی، ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہُوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ:

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر"

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس اُنگلیاں وہی پر رُک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔

ارشاد ہُوا "یہ آپ گا رہے ہیں؟" ("زور" "آپ" پر)

میں نے کہا "اجی، میں کس لائق ہوں۔۔۔۔۔۔۔ لیکن خیر فرمائیے۔"

بولے "ذرا۔۔۔۔۔۔۔ وہ میں۔۔۔۔۔۔ ڈسٹرب ہوتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔"

بس صاحب، ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہُوئی تھی فوراً مر گئی۔ دل نے کہا "او۔۔۔۔۔ نابکار انسان

دیکھ پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں ------"

صاحب، خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا! ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔"

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے۔ دانت بھینچ لیے، نکٹائی کھول دی، آستینیں چڑھالیں، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؛ سامنے سُرخ، سبز، زرد سبھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں؛ فیصلہ یہ ہُوا کہ پہلے کتابوں کو میز پر ترتیب سے لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعے کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا، چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا، ایک نوٹ پیپر پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر ۱۵ اپریل تک کے دن گنے، صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانچ سو جواب آیا ------ لیکن اضطراب کی کیا مجال ہو جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا پچھتائے کہ صبح تین ہی بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے۔ لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا تو لغو بات ہے البتہ پانچ ----- چھ ------ سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سوجانا چاہیے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے، بستر میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں؛ یوں ہماری اپنی قوتِ ارادی کافی زبردست ہے۔ جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں، لیکن پھر بھی کیا حرج ہے۔ ڈرتے ڈرتے آواز دی "لالہ جی!" انھوں نے پتھر کھینچ مارا "یس"۔ ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ لالہ جی، صبح آپ کو بڑی تکلیف ہُوئی میں آپ کا ممنون ہوں، کل اگر ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت چھ بجیں ------ جواب ندارد۔ میں نے پھر کہا، جب چھ بج چکیں تو ------ سنا آپ نے ------"

چپ ------ "لالہ جی!" کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا، "سن لیا ------ سن لیا ------ چھ بجے جگا دوں گا ------ تھری گا مابس فور ایلفاپلس ------"

ہم نے کہا "ب ــ ب ــ ب ــ بہت اچھا یہ بات ہے۔"

توبہ ------ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انھوں نے دروازے پر

گھونسوں کی بارش شروع کردی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا۔ ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہولے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک دو منٹ بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہرصورت جیسا کہ میرا فرض تھا، میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اس شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کردی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہرحال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی ------ پھر کا پتا نہیں۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا۔ شاید سر اس میں لپیٹ دیا یا شاید کھانسا کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ خیر، یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے، لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا سو رہے تھے۔ نہیں، ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں اور نہ میں ------ کیا پتا لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں، لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہے کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر ملامت سُنتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا، مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں، اُن کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ اُن کی دل شکنی نہ ہو حد درجے کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور رُوح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا" لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے۔ جو پڑھو، خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی، خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے یعنی صبح بجائے صبح کے شام ہُوا کرتی، تو دن کیا بری طرح کٹا کرتا۔"

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی دادیوں دی کہ آپ پوچھنے لگے، "تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا؟" میں نے کہا "ہاں ہاں ------ واہ واہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ------ بے شک ------"

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعے کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جوڑ دیں، کرسی کو چارپائی کے قریب کھسکا لیا، اور کوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا، کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے، دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا، تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے اُن کو "گڈ مارننگ" کیا اور نہایت بے دارانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے ۔ دل سے کہا ، کہ "دل بھیا صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے ، ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے ۔" دل نے کہا " اور کیا ؛ تمھارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں ۔" ہم نے کہا ، " سچ کہتے ہو یار ۔ یعنی ہم سُستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں ، تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں ۔

اس وقت لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اُڑاتے ہوں گے اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں ۔ بھئی ، کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں ۔"

ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے ----- " خوب ----- تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں ۔ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے ۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے ۔ ہم بھی روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں ، نہ خدا کا ڈر نہ رسُول کا خوف ۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے ۔ اکبر بے چارہ یہی کہتا کہتا مر گیا ، لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی ------ " لحاف کانوں پر سرک آیا ----- " تو گویا ہم آج اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں ------- بہت ہی پہلے ------ یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے ------ کیا بات ہے ! خداوندان کالج بھی کس قدر سُست ہیں ۔ ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہُوا کرے ---- ( لحاف سر پر ) ------ بات یہ ہے کہ تہذیبِ جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے ------ " ( آنکھیں بند ) ------- " تو اب چھ بجے ہیں ۔ تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے ۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں ـــــ شیکسپئیر یا ورڈز ورتھ ـــ ؟ میں جانوں شیکسپئیر بہتر ہوگا ۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر کیا چیز ہو سکتی ؟ " پھر خیال آیا کہ " دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں ، ورڈز ورتھ پڑھیں ۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسّر ہوگا اور دل اور دماغ نیچر کی خاموش دلآویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے ۔ لیکن شیکسپئیر ------ نہیں ورڈز ورتھ ہی ٹھیک رہے ------ شیکسپئیر ہیملٹ ـــــ لیکن ورڈز ورتھ ------ لیڈی میکبتھ ------ دیوانگی ------ سبزہ زار ------ بادِ بہاراں ـــــ صید ہوس ـــــ کشمیر ـــــ میں آفت کا پرکالہ ہوں ۔"

یہ معما اب فلسفہ مابعد الطبیعات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈز ورتھ پڑھنے

کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے ۔ اس میں نامعلوم کیا بھید ہے۔

کالج ہال میں لالہ جی ملے کہنے لگے "مسٹر، صبح میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی آپ نے جواب نہ دیا؟" میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا، "اوہو لالہ جی! یاد نہیں، میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا۔ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔ بولے "وہ تو ٹھیک ہے، لیکن میں ------- اس کے بعد ------- کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی ۔ آپ بولے نہیں۔" ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے اُن کو دیکھا۔ گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں ------- اور پھر متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے ۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے ۔ پھر یکایک ایک محجوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کر کہا "ہاں، ٹھیک ہے — ٹھیک ہے — میں اس وقت — اے ------- اے نماز پڑھ رہا تھا۔"

لالہ جی مرعوب ہو کر چل دیے اور ہم اپنے زہد و اتقاء کی مسکینی میں سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔ اب یہی ہمارا روز مرّہ کا معمول ہو گیا ہے ۔ جاگنا ۱ چھ بجے ، جاگنا ۲ دس بجے ۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز -------!

# مشق

۱ - مصنف نے ہاسٹل میں رہنے کے جو فوائد بیان کیے ہیں آپ کی رائے میں ان کے علاوہ کیا کیا فوائد یا نقصانات ہیں؟

۲ - درج ذیل جملوں کا مطلب بیان کیجیے۔

( i ) میں کیا میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہو گی۔

( ii ) دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد و شدد کو خیر باد کہہ دُوں، لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہم نے لے رکھا ہے۔

( iii ) ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں ، خدا کا ڈر نہ رسولؐ کا خوف۔

( iv ) بھئی، کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔

( v ) اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسّر ہو گا اور دل اور دماغ نیچر کی خاموش دلآویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے۔

۳ - ذیل کے الفاظ اور تراکیب اپنے جملے میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کے معنی واضح ہو جائیں۔

زہد و اتقاء، دُنیا و مافیہا ، غنچہ دہنی ، کسالت ، ادائے فرض ، مقدم ، مستعد ، محجوبانہ ، مرعوب ، تعمق۔

۴ - گزشتہ جماعتوں میں آپ حروف کی بابت تفصیل سے پڑھ چکے ہیں ۔ آپ کو ان کی مختلف اقسام سے خُوب شناسائی

ہو چکی ہوگی۔ اس سبق میں سے ایسے چھ جملے منتخب کیجیے جن میں حروفِ جار، حروفِ عطف اور حروفِ اضافت کا استعمال ہُوا ہو (ہر حرف کی مثال میں دو دو جملوں کا انتخاب کیجیے)

۵۔ متکلم کے صیغے کو غائب میں بدل کر اس مضمون کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

۶۔ گزشتہ جماعتوں میں رموزِ اوقاف (Punctuation) سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ اس سبق میں جابجا سکتے (،)، ختمے (۔) اور واوین (" ") کا استعمال ہُوا ہے۔ آپ ان علامات پر غور کیجیے اور بتائیے کہ ان کا استعمال عبارت میں کن کن مواقع پر ہوتا ہے؟ اپنے کسی پسندیدہ موضوع پر ایک پیراگراف لکھیے اور اس میں حسبِ موقع ان علامات کو ظاہر کیجیے۔

۷۔ اس سبق سے مرکباتِ توصیفی تلاش کر کے لکھیے۔

۸۔ سبق میں ایسے پانچ جملے تلاش کر کے لکھیے جن میں محاورے استعمال کیے گئے ہوں۔

۹۔ ان جملوں میں کن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت عیسیٰؑ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قُم" کہہ دیا کرتے ہوں گے زندہ ہوگیا تو ہوگیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے۔

# ایک ملازم کی ضرورت ہے

شوکت تھانوی

جی ہاں ایک ملازم کی ضرورت ہے، جس کے لیے پہلے تو بہت سی شرطیں تھیں کہ ذرا معقول قسم کا کھانا پکانا جانتا ہو، ایمان دار ہو، صاف ستھری عادتیں ہوں، اس کی زبان دراز نہ ہو، مہذب ہو، کسی نشے کا عادی نہ ہو، سزا یافتہ نہ ہو، خوب صُورت نہ سہی مگر بے حد بد صُورت نہ ہو، عمر ایسی نہ ہو کہ پرورش کا بار بھی ہم ہی پر پڑے اور نہ ایسی کہ تجہیز و تکفین کے اخراجات بھی ہمارے ہی سر آئیں۔ کسی متعدی مرض میں مبتلا نہ ہو، علی الحساب صاحبِ اولاد نہ ہو، وغیرہ وغیرہ۔ مگر اب امتدادِ زمانہ سے صرف ایک شرط باقی رہ گئی ہے کہ وہ محض طوطا چشم نہ ہو، باقی سب کچھ منظور ہے یعنی اس کا مہاجر ہونا تو منظور ہے، مگر وہ مستقلاً ہجرت کا عادی نہ ہو گیا ہو، اٹھائو چولھا نہ ہو۔

بات یہ ہے کہ صاحب، ناک میں دم ہو گیا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن ایک نیا ملازم اپنے نئے حالات کے ساتھ ہمارے لیے نت نئی مصیبتیں لے کر نازل ہو جاتا ہے اور عین اس وقت جب کہ ہم ہر طرح کی نفس کشی کے بعد اپنے کو اس کی کوتاہیوں کا خوگر بنا چکتے ہیں وہ داغِ مفارقت دے کر اور ایک آدھ برتن، کچھ کپڑے تھوڑے سے روپے وغیرہ لے کر غائب ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان چیزوں کے جانے سے نہ ہم لٹ جاتے ہیں، نہ یہ کوئی ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہ ہو سکے مگر یہی کیا کم ہے کہ ہماری نظروں میں جنسِ وفا کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے اور ہماری قوتِ فیصلہ جواب دے چکی ہے کہ اب اس دنیا میں کس کو باوفا سمجھیں اور کس کو بے وفا۔

ایک سے ایک پیکرِ وفا اور مظہرِ صدق و صفا تشریف لاتے ہیں، جن میں سے بعض کی آنکھوں میں تو نور کی جگہ بھی مروّت ہی چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وفاداریوں کا کچھ اظہار وہ زبان سے کرتے ہیں، باقی چہرے سے ٹپکاتے ہیں، آنکھوں سے برساتے ہیں اور آخر کار اس کا قائل کر دیتے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی یہ دنیا اب ایسی بھی وفا سے خالی نہیں ہے۔

تقسیمِ ہند تک ہمارے پاس جو بزرگ محترم تھے، وہ اس تقسیم کے بعد ہم سے اس طرح بچھڑ گئے گویا

باونڈری کمیشن نے ہمارے اور ان کے درمیان ایک خط کھینچ کر ان کو ہم سے چھین کر ہندوستان کو بخش دیا اور ہم کو مجبور کیا گیا کہ ہم نئے ملازم کی جستجو شروع کریں۔ مگر اس سلسلے میں زیادہ پریشان نہ ہونا پڑا۔ تیسرے ہی دن عین اس وقت جب کہ ہم ہوٹل کا کھانا کھانے کے بعد نمک کے پانی سے غرغرہ کر رہے تھے تاکہ بازاری کھانے کی چربی حلق کو کوئی مستقل نقصان نہ پہنچائے ہم کو یہ مژدۂ جاں فزا سنایا گیا کہ ملازمت کا ایک اُمیدوار آیا ہے، حالانکہ وہ نہیں بلکہ اس کے امیدوار ہم خود تھے۔ ہم دیدہ و دل فرش راہ کرتے ہوئے باہر آئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک عجیب الخلقت درویش صفت بزرگ کھڑے ہُوئے بیڑی پی رہے ہیں اور دُوسری جلی ہُوئی بیڑی ان کے کان میں لگی ہُوئی ہے۔ اس بدتمیزی کے ساتھ بیڑی پینا ہم کیوں کر برداشت کرسکتے تھے۔ ڈانٹنے ہی والے تھے کہ دل نے کہا

ع تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

لہٰذا نہایت ادب سے خود اُن کو سلام کر کے دریافت کیا، "کیوں بھئی نوکری کرو گے؟" جواب کا استغنا ملاحظہ ہو، "مل جائے گی تو کرلیں گے۔ ورنہ گھر کے رئیس تو ہیں ہی۔ عرض کیا" کھانا پکانا جانتے ہو؟" جواب ملا، "جانتے کیوں نہیں ہیں۔" عرض کیا "اکیلے ہو یا بال بچے بھی ہیں؟" فرمایا، "ہاں کچھ بال بچے بھی ہیں، مگر یہاں میں اکیلا ہی ہوں۔ تنخواہ کیا ملے گی؟" عرض کیا، "بھئی، تنخواہ کا فیصلہ تو تمھارا کام دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ تم آج کھانا پکا کر دکھاؤ، اس کے بعد ہم تمھارا اندازہ کرسکیں گے۔"

وہ راضی ہو گئے اور ان کو باورچی خانے کا چارج دے کر سمجھا دیا گیا کہ اس وقت کے کھانے میں یہ چیزیں تیار کرنا ہیں۔ جو کچھ بھی سامان طلب کرتے رہے اُن کو ملتا رہا اور ہم سب خدا کا شکر ادا کرتے رہے کہ ملازم کے سلسلے میں جن پریشانیوں کا اندازہ تھا کم سے کم ہم کو ان سے دوچار ہونا نہیں پڑا اور شکر ہے خداوند تعالیٰ کا کہ اس نے اپنے خزانہ غیب سے ہم کو ایک ملازم عطا کر ہی دیا۔ آج معلوم یہ ہو رہا تھا گویا ہم سے بڑھ کر خوش قسمت اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ مسلسل یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کس کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔ خدا کی دین کا مُوسیٰؑ سے احوال پوچھنے کی بھی ضرورت نہ تھی خود ہی قائل ہو رہے تھے کہ وہ چھپر پھاڑ کر ملازم دیتا ہے۔ اگر کوئی ملازم کے متعلق ذرا بھی اس کی شان سے گری ہُوئی کوئی بات کرتا تھا تو اس کی جان کو آجاتے تھے۔ بھابی جان نے باورچی خانے کا چکر لگا کر کہا، "باورچی تو یہ خاک بھی نہیں ہے۔ صورت سے تو یہ چڑی مار نظر آتا ہے۔" ہم نے جل کر کہا، "مصیبت تو یہ ہے کہ آپ کے یہاں باورچی بھی وہی ہو سکتا ہے جو حسن کے مقابلے میں انعام پا چکا ہو۔" بیگم صاحبہ نے کہا، "مجھے تو اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔" ہم نے کہا، "سرخ آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔ کاش تم کو معلوم ہوتا کہ آنکھوں کی سرخی بھی ایک حسن ہے۔"

گلابی ان آنکھوں میں سُرخی کے ڈورے
مئے آتشیں رنگ کے دو کٹورے

آپا نے کہا، "چاہیے تھا کہ پہلے اس کو غسل کرا کے کپڑے بدلوا دیتے، پھر کھانا پکواتے، کس قدر گندا ہے کم بخت!"
ہم نے ڈر کر کہا، "خدا کے لیے اتنے زور سے کم بخت نہ کہیے، اگر سن لیا اس نے تو دل شکنی ہوگی۔"
کھانے کے وقت تک اس کے پکائے ہوئے لذیذ کھانوں کے تصور سے معدے کو مشتعل کرتے رہے اور کھانے کے وقت سارا گھر ایک ہی دستر خوان پر جمع ہوگیا۔ دستر خوان سجایا گیا اور سب سے پہلے ہم نے قورمہ نکالا۔ اس قورمے کی سب سے پہلی خصوصیت تو ماہر باورچی نے یہ رکھی تھی کہ وہ صورت سے قورمہ نظر نہ آتا تھا۔ آپ نے شاہی دستر خوانوں کا حال پڑھا ہوگا کہ یہ شاہی باورچی کھانا پکانے سے زیادہ کرتب دکھاتے تھے اور گویا پہیلیاں بجھاتے تھے۔ مثلاً آصف الدولہ بہادر کے باورچی نے ان کو اپنے سمدھی کے سامنے محض اس لیے سرخرو کردیا تھا کہ سمدھی صاحب قورمے کو مربہ سمجھ کر کھا گئے تھے، اس لیے کہ وہ مربے کی صورت کا تھا۔ غالباً یہی آرٹ ہمارے اس باورچی نے اس قورمے میں بھی صَرف کیا تھا کہ وہ قورمے کی بجائے ہو بہو رسا دل نظر آرہا تھا۔ بھابی نے اس کو دیکھتے ہی پوچھا "یہ کیا چیز ہے خان ساماں؟" بڑے فخر سے خانساماں نے فرمایا، "کاری بیگم صاحب۔"
ہم نے اپنے دل میں سوچنا شروع کیا کہ یا اللہ! یہ کونسی کاری ہے۔ کاری گری کے تو خیر ہم قائل ہو چکے تھے، مگر کاری کی تشخیص باقی تھی اور زیادہ تر خیال یہ تھا کہ چونکہ یہ حضرت صورت سے کچھ مدکچی اور کچھ چرسیے نظر آرہے ہیں، لہٰذا ہو نہ ہو یہ آبکاری ہوگی۔ ہم ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ آواز آئی "آخ تھو" بیگم صاحبہ نے منہ بناتے ہوئے کہا، "توبہ ہے، اتنا نمک! تیزاب کر دیا شوربے کو بالکل۔"
اور اب ہم جو چکھتے ہیں تو واقعی معلوم ہوا کہ سالن میں نمک ڈالنے کی بجائے ان حضرت نے نمک کے سالن میں گوشت ڈال دیا ہے۔ خیر یہ تو ممکن ہے کہ اس بے چارے نے خود اپنے کو بے حد نمک خوار بنانے کے لیے ایسا کیا ہو، مگر اس کے علاوہ جو دوسری خصوصیات تھیں اُن کو ہر اناڑی سمجھ بھی نہیں سکتا۔ البتہ چونکہ ہم اس عرصے میں ایک سے ایک بدمزہ کھانا چکھ چکے تھے، لہٰذا اس قورمے کو چکھ کر تو دنگ ہی رہ گئے۔ اس میں گوشت کا مزہ مع اپنی خوشبو کے بالکل علیحدہ تھا، مسالے کے تمام اجزا اپنا اپنا انفرادی رنگ اور ذائقہ رکھتے تھے، گھی سب سے الگ تھا اور بحیثیتِ مجموعی معلوم ہوتا تھا کہ قورمہ پکانے کے بعد پہلے اس کو غسل دیا گیا ہے، پھر وہ نہایا دھویا قورمہ ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ کباب توڑنا چاہا تو پتا چلا کہ ابھی تک سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود کباب توڑنے کے اوزار وضع نہیں ہو سکے۔ دوسرے پتھر کے کباب کھانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ معلوم نہیں یہ کباب کھانے کے لیے تھے یا سر پھوڑنے کے لیے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قاب میں ترازو کے باٹ رکھے ہوئے ہیں اور اُن کو اٹھاتے ہی غالب کا یہ مصرعہ خود بخود یاد آیا جاتا تھا کہ:

ع سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

بمشکل تمام طے کیا کہ فیرنی ہی پر اکتفا کریں گے۔ مگر اس کا پہلا چمچہ سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گیا۔ معلوم ہوا کہ

دھوبی کے کلپ[۱] میں منہ پڑا ہے اور منہ میں پہلے سے کوئی میٹھی چیز تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جب سارا گھر فاقے سے اٹھ گیا اور خود ہمارے محسن خانساماں صاحب بھی کھاپی کر فارغ ہو گئے تو آپ اپنی اس کارگزاری کی روشنی میں معاملات طے کرنے کے لیے بیڑی پیتے ہوئے تشریف لائے اور سر کھجاتے ہوئے بولے، "اچھا جی، تو پھر بات ہو جائے۔"

ہم اس عرصے میں طے کر چکے تھے کہ اگر یہ حضرت خود ہم کو کوئی تنخواہ دے کر یہ کھانا کھانے پر نوکر رکھنا چاہیں گے، تو بھی ہم ان سے جان کی امان چاہیں گے۔ مگر دیکھنا تو یہ تھا کہ خود ان کی اپنے متعلق کیا رائے ہے؟ لہٰذا عرض کیا، "ہاں بھئی، تو شرطیں کیا ہیں تمھاری؟" بولے۔ "تنخواہ تو میں تیس[۲] روپے اور کھانے سے کم نہ لوں گا۔ اس کے بعد یہی کپڑا وپڑا رہ جاتا ہے وہ دے دیا کیجیے گا اور بیڑی کے دو بنڈل روز کے۔ نائی اور دھوبی کا خرچ تو مالکوں کے سر ہوتا ہی ہے۔ اور شرطیں کیا ہوں گی۔" عرض کیا کہ "رہیں گے کہاں جناب، اور کچھ بستر وستر وغیرہ ہے یا نہیں؟" بڑے توکل کے ساتھ فرمایا، "رہنے کا کیا ہے یہیں رہ جائیں گے، اور بستر تو آپ کو دینا ہی پڑے گا۔"

اب ہم نے نہایت ادب سے ان کو سمجھایا کہ "بندہ نواز! اول تو آپ کا انسان ہونا ہی مشکوک ہے، خدا جانے آپ کن جانوروں میں اب تک رہ رہے ہیں۔ دوسرے باورچی تو آپ ایک سرے سے ہیں ہی نہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر آپ انسانیت کے جامے میں رہ سکیں تو آپ کو گھر کے کام کاج کے لیے رکھا جا سکتا ہے، مثلاً گھر کی صفائی، جوتوں پر پالش کرنا، بچوں کو اسکول پہنچا دینا، بازار سے ضرورت کی چیزیں لا دینا وغیرہ اور اس کی تنخواہ آپ کو فی الحال بیس روپے مل سکے گی۔" حادثہ یہ ہوا کہ وہ راضی ہو گئے اور رہنے لگے گھر میں۔ دوسرے دن ان کو حجامت اور غسل وغیرہ کے ذریعے اوورہال[۳] کیا گیا اور اب وہ تین چار گز کے فاصلے سے کچھ انسان نظر آنے لگے۔ مگر تھے وہ مبارک قدم، اس لیے کہ دوسرے ہی دن ایک باورچی آ گیا۔

غالباً چوتھا یا پانچواں دن تھا کہ ایک بائیسکل، جو ملازموں کے لیے رہتی تھی، دس روپے کا ایک نوٹ، جس میں سے ان کو چائے کا ڈبہ لانا تھا، ایک کمبل، جو وہ اوڑھے ہوتے تھے، لے کر جو غائب ہوئے ہیں تو آج آتے ہیں۔ پولیس میں رپورٹ تو لکھوا دی ہے، مگر پولیس والوں کے پاس ایک یہی کام تو ہے نہیں کہ ان کے ہجر سے بے قرار ہو کر ان کی جستجو شروع کر دیں۔ ان کے جانے کے بعد سے باورچی صاحب نے بھی رنگ بدلنا شروع کر دیے اس رنگ بدلنے پر یاد آیا کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ شاید اتنا رنگ نہیں بدلتا جتنا یہ ملازم ملازم کو دیکھ کر رنگ بدلتے ہیں۔

---

۱ - کلف

۲ - شوکت صاحب کا یہ مضمون ۴۸ء یا ۴۹ء میں تحریر ہوا تھا جب کہ بیس تیس روپے کی بڑی قیمت تھی۔

۳ - Overhaul

اب ان خانساماں صاحب نے غالباً اس بات پر غور کیا ہوگا کہ اگر اس ناکارہ ملازم کو حُسنِ خدمات کا یہ صلہ مل سکتا ہے کہ وہ بائیسکل، دس روپے اور ایک کمبل لے کر غائب ہو جائے تو میرا حق یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہے۔ یا غالباً یہ خیال آیا ہو کہ اب تو لے دے کر میں ہی اکلوتا ملازم رہ گیا ہوں اور یہ بابا لوگ کے والدین، آقا لوگ اس بات پر مجبور ہیں کہ میری ناز برداریاں کریں، لہٰذا اسی شام کو ان حضرت کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اختلاج کا دورہ پڑا اور وہ سیدھے ہمارے پاس تشریف لائے "صاحب، میں مجبور ہوں، اختلاج کا پرانا مریض ہوں اور جب دورہ پڑ جاتا ہے تو مجھ سے پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔" عرض کیا، "بھئی تم کچھ نہ کرو، آرام کرو۔" کہنے لگے، "صرف اس سے تو کام نہیں چلے گا، اختلاج میں گاجر کا حلوہ مفید ہوتا ہے اور میرے مزاج کے خلاف کوئی بات بھی نہ ہو۔" نہایت عاجزی سے عرض کیا، "یہ تو ٹھیک ہے، مگر انصاف شرط ہے، اب گاجر کا حلوہ کون بنائے؟ گاجریں کون لائے؟ رہ گئی یہ بات کہ مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہو، اس سلسلے میں آپ کو معلوم ہے کہ ہم ویسے ہی آپ کی چشم و ابرو کے اشاروں کے تابع دار واقع ہوئے ہیں۔" کہنے لگے، "دام مل جائیں تو گاجر کا حلوہ بھی برابر والی کوٹھی کے خانساماں سے بنوا لوں گا۔"

غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ برابر والی کوٹھی کا خانساماں ہمارے کچھ سوتیلے عزیزوں میں سے ہے۔ قصور صرف اتنا ہے کہ یہ حضرت پہلے ہمارے یہاں تشریف لائے تھے اور چونکہ ہم نے ان کی یہ شرط منظور نہ کی تھی کہ چار مہینے کی تنخواہ پیشگی دے دیں، لہٰذا وہ بس اتنی سی بات پر ایسے ناراض ہوئے ہیں کہ اب مستقل طور پر ہمارے ہر ملازم کو بھڑکاتے ہیں۔ مگر اس وقت مقطع میں کچھ ایسی سخن گسترانہ بات آپڑی تھی کہ ہم نے چپکے سے گاجر کے حلوے کے دام خانساماں صاحب کو دے دیے حالانکہ اس کے باوجود برابر والی کوٹھی کے خانساماں نے ان حضرت کو ہمارے یہاں سے رفو چکر کر دیا اور یہ حضرت بھی وفا نہ کر سکے۔

## مشق

۱۔ اقتباسات ذیل کا مفہوم اپنی زبان میں اس طرح بیان کیجیے کہ مشکل الفاظ و محاورات کی وضاحت بھی ہو جائے۔

(الف) "ایک سے ایک پیکرِ وفا اور مظہرِ صدق و صفا تشریف لاتے ہیں، جن میں سے بعض کی آنکھوں میں تو نور کی جگہ بھی مروت ہی چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وفاداریوں کا کچھ اظہار وہ زبان سے کرتے ہیں، باقی چہرے سے ٹپکاتے ہیں، آنکھوں سے برساتے ہیں اور آخر کار اس کا قائل کر دیتے ہیں کہ اس گئی گزری حالت میں بھی یہ دنیا اب ایسی بھی وفا سے خالی نہیں۔"

(ب) "کباب توڑنا چاہا تو پتا چلا کہ ابھی تک سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود کباب توڑنے کے اوزار وضع نہیں ہو سکے۔

دوسرے پتھر کے کباب کھانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ معلوم نہیں یہ کباب کھانے کے لیے تھے یا سر پھوڑنے کے لیے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قاب میں ترازو کے باٹ رکھے ہوئے ہیں اور ان کو اٹھاتے ہی غالب کا یہ مصرعہ خود بخود یاد آجاتا تھا کہ

ع:- سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا"

۲ - ملازم رکھنے کے لیے مصنف نے پہلے کون سی شرطیں مقرر کی تھیں؟

۳ - مصنف ملازم کی تلاش میں کن مشکلات سے دوچار رہا؟

۴ - جب ملازم مل گیا تو اس نے اپنے تقرر کے لیے کیا شرائط پیش کیں؟

۵ - مصنف کا اس باب میں کیا ردِ عمل تھا؟

۶ - ملازم نے جو کھانے پکائے، ان کے نام بتائیے۔ وہ کھانے چکھ کر مصنف اور گھر کے دوسرے افراد نے کیا محسوس کیا؟

۷ - ملازم نے اپنے آقا سے کیا سلوک کیا؟

۸ - ملازم کے بارے میں مصنف کی رائے کے اسباب کیا ہیں؟ بیان کیجیے۔

۹ - ذیل کے الفاظ اور محاورات کے معنی بتا کر انھیں جملوں میں استعمال کیجیے۔

اٹھائی چولھا، خوگر، فراست الیہ، قحط الرجال، علی الحساب، ناک میں دم ہونا، کرتب دکھانا، جان کی امان چاہنا، دیدہ و دل فرش راہ کرنا، مفارقت۔

۱۰ - اپنے کالج کے ملازمین میں سے کسی ایک کا خاکہ لکھیے جو آپ کو فرض شناس نظر آتا ہو۔

۱۱ - سابقے اور لاحقے بدل کر متضاد لفظ بنائیے۔

بدصورت، باوفا، ایمان دار، خوش قسمت، بدتمیز، کم بخت، سرخرو۔

۱۲ - اس جملے میں کس تاریخی واقع کی طرف اشارہ ہے۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے سوال پوچھنے کی ضرورت نہ تھی خود ہی قائل ہو رہے تھے کہ وہ چھپڑ پھاڑ کر ملازم دیتا ہے۔

# اصفہان ، اصفہانیات

سفرنامہ ( ایران ) ۱۹۶۳ء

ابنِ انشا

اصفہان کی مسجد شاہ کے ایک طرف حجروں کی بجائے لمبے تالار ہیں ایک طرف چند خواتین کھڑی نماز ادا کر رہی تھیں۔ اصفہان کی مسجد شاہ کا نقشہ عام مسجدوں سے مختلف ہے۔ یہاں قبلے کی محراب صدر دروازے کے محاذ میں واقع نہیں ہے خیر ہم نے بھی ہاتھ پیچھے باندھ کبھی اس محراب کے طغروں کو دیکھا کبھی اس محراب پر باندازِ شائستہ نظر ڈالی۔ بغلی حجروں اور تالاروں میں جھانک لیے ان کے اندر بھی باریک کام ہو رہا تھا۔ ایک جگہ ایک گائیڈ کچھ امریکیوں کو کوئی چیز دکھا رہا تھا لیکن ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ ہم فارغ ہو کر نکلنے کو تھے کہ مرتضیٰ نکوئی مل گیا۔

مرتضیٰ نکوئی ایک سیدھا سادا سا لڑکا تھا، منحنی، بیمار سا، کوئی سولہ سترہ برس کا سن ہوگا، سلام کر کے بولا "آپ انگریزی جانتے ہیں؟"

ہم نے کہا "ہاں تھوڑی تھوڑی۔"

بولا "مجھے انگریزی بولنے کا شوق ہے میں یہاں کے امریکن مدرسے میں پڑھتا ہوں۔ چھٹی کے روز یہاں آجاتا ہوں۔ چونکہ امریکی اور دوسرے انگریزی دان یہاں ہوتے ہیں ان سے بولنے کی مشق کرتا ہوں۔"

ہم نے کہا "بڑی اچھی بات ہے۔"

"انگریزی بولتے بولتے آپ کو شہر بھی دکھادوں گا۔"

ہم نے کہا "ازیں چہ بہتر۔"

بولا "مسجدیں تو سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بازار چلیں۔"

ہم نے کہا "ترتیب وار چلیں گے۔ بازار کوئی بھاگا نہیں جاتا۔"

بولے "بارہ بجے بند ہو جائے گا۔"

ہم نے کہا "بارہ بجنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے اور اس مسجد میں ہمیں پانچ منٹ لگیں گے۔" مرتضیٰ نکوئی

ہمیں اُدھر کھینچ رہا تھا ہم ادھر جا رہے تھے، آخر ہم نے کہا ہمیں کوئی خریداری نہیں کرنی۔ بازار سے ہمیں دلچسپی نہیں۔ ہم تو مسجد لطف اللہ دیکھیں گے۔

بولے "خیر جلدی سے دیکھ لیجیے۔ بازار میں اچھی اچھی چیزیں ہیں اور بعض دکان دار میرے واقف ہیں۔ مال عمدہ اور باکفایت دیں گے۔"

ہم نے کہا "دیدہ خواہد شد۔"

مسجد شیخ لطف اللہ میں داخل ہو کر ہم نے کہا "دو ٹکٹ دیجیے۔"

مرتضیٰ نکوئی نے کہا "صرف ایک لیجیے۔ مجھ سے یہ لوگ ٹکٹ نہیں مانگتے روز کا آنے والا ہوں۔"

ٹکٹ والا بھی مسکرایا۔ ہمارا بھی ماتھا ٹھنکا۔ یہ زنانہ مسجد تھی اور شیخ لطف اللہ جن کے نام پر بنی ہے غالباً بیگمات شاہی کے اتالیق تھے۔ یہ ۱۶۰۲ء میں بننی شروع ہوئی اور ۱۶۱۸ء میں ختم ہوئی (مسجد شاہ ۱۶۱۲ء میں بننی شروع ہوئی تھی اور اٹھارہ سال میں مکمل ہوئی) عباس صفوی کے اصفہان کو اکبر کا آگرہ یا شاہجہان کی دِلّی سمجھیے کہ قدم قدم پر جلال و جمال نمایاں ہے۔

مسجد لطف اللہ میں واقعی پانچ دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ حالانکہ اندر کام اتنا باریک اور نفیس تھا کہ شاید کسی اور مسجد میں نہ ہوگا۔ اب پھر مرتضیٰ نکوئی نے بازار کی طرف کھینچنا شروع کیا لیکن ہمیں ایک چھتا ہوا خستہ سا بازار نظر آیا۔ اس کے داہنی طرف تنگ اور پرپیچ گلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مرتضیٰ نکوئی بولے "آپ نے قالین بافی کا کارخانہ دیکھا؟"

ہم نے کہا "کارخانوں سے ہمیں دلچسپی نہیں۔"

بولے "ویسا مشینوں والا کارخانہ نہیں۔ بلکہ وہ چھوٹی لڑکیاں بُنتی ہیں۔

ہم نے کہا "وہ تو دیکھیں گے" گلیوں اور گلیاروں میں گزرتے مرتضیٰ نے ایک دروازے پر جو کسی طرف سے کارخانہ معلوم نہ ہوتا تھا دستک دی۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون نے دروازہ کھولا۔ عورتیں اِدھر اُدھر ہو گئیں۔ اندر تنگ سا صحن تھا اور اس کے پہلو میں ذرا سا برآمدہ، اس میں ایک چوبی تخت تھا اور برآمدے کی محراب کے ساتھ قالین کا تانا تنا ہوا تھا۔ تین چار چھوٹی چھوٹی بچیاں اس میں بانا بن رہی تھیں۔ گویا سارا کام ہاتھ کا تھا۔ ہم نے کہا "یوں تو بہت دیر لگتی ہوگی؟"

ان محترمہ نے فرمایا "تین تین چار چار سال لگ جاتے ہیں۔ ایک قالین تو ۱۸ سال میں بنا گیا تھا۔" ہم ایک مسقّف گلی میں سے ہوتے ہوئے سیدھے بازار میں آنکلے۔ بازار کا مطلب طہران یا اصفہان میں عام بازار نہیں بلکہ پرانا چھتا ہوا بازار ہے، جس میں محرابی دروازوں کی دکانیں ہوتی ہیں۔ طہران میں اسے بازار بزرگ کہتے ہیں،

اصفہان میں فقط بازار۔

مرتضیٰ نکوئی ہمیں پکڑ کر بازار کی پہلی ہی دکان پر لے گئے اور بولے "یہ بڑی اچھی دکان ہے جو آپ کو یہاں ملے گی سارے اصفہان میں نہیں ملے گی۔" ادھر دکان دار بھی اہلاً وسہلاً کہتا اخلاق سے دہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ہمارا ماتھا پھر ٹھنکا۔

اب عالم یہ تھا کہ ہمارا جی بازار کی سیر کو مچل رہا تھا اور آقائے مرتضیٰ نکوئی کو اصرار تھا کہ خریداری کریں۔ ہم نے کہا "خیر پہلے ہم ذرا بازار کے اس سرے تک ہو آئیں پھر جہاں سے اچھی چیز ملے گی لیں گے بشرطیکہ دام بھی مناسب ہوئے۔"

نکوئی صاحب بولے "بازار میں آگے کچھ نہیں ہے چند حلوائیوں اور ٹھٹھیروں کی دکانیں ہیں۔ سو آپ کو منقش ظروف اور مٹھائی درکار ہوئی تو اس کی بھی اچھی دکانیں مجھے معلوم ہیں لیکن جہاں تک کپڑے، قالینوں اور کشیدہ کاری کے نمونوں اور دوسری نازک چیزوں کا تعلق ہے اس سے بہتر کہیں نہ ملیں گے ورنہ مجھے کیا پڑی تھی کہ آپ کو یہاں لاتا۔"

ہم نے کہا "بھائی ہم بدل و جان آپ کے ممنون ہیں لیکن وہ اس بازار کے سرے پر جو شکستہ محراب دار عمارت ہے اسے ہم ضرور دیکھیں گے۔"

بولے "اجی وہ تو ایک مسجد ہے۔ مسجد بھی کیا پرانے زمانے کا کھنڈر ہے جس پر کچھ کتبے وتبے لکھے ہیں۔ اسے دیکھ کے کیا کیجیے گا۔"

ہم نے کہا "بھائی یہاں ہم آئے ہی ان کھنڈروں اور کتبوں کے لیے ہیں ورنہ شیخ رحمت اللہ کی مسجد اور علی قاپو کی بجائے بانک ملی یا شہرداری (میونسپلٹی) کی شاندار عمارتیں کیوں نہ دیکھتے اور یہاں بازار کا رُخ کیوں کرتے جب کہ طہران کی فروش گاہ فردوسی میں بھانت بھانت کی چیزوں کے انبار لگے ہیں۔ ہم تو پرانی چیزوں کی سوندھی خوشبو سونگھنے آئے ہیں۔ کنکریٹ کے محل طہران اور کراچی میں بہت ہیں۔"

یہ سارا فلسفہ مرتضیٰ نکوئی کی سمجھ میں نہ آیا، جس سے واقعی گمان ہوتا تھا کہ امریکن سکول میں پڑھتا ہے۔ اس نے بیس تیس قدم آگے جانے کی اجازت دی اور ہم مرکزی چورستے کا موڑ مڑنے کو تھے کہ اس نے آستین پکڑ کر کھینچ لیا۔ بس بس آگے مت جائیے گا۔

ہم نے کہا "اچھا اس دکان پر یہ بٹوہ خوب ہے اسے دیکھیں۔"

بولے "یہ اُس دکان پر بھی ہے اور یہاں سے کچھ قدرے سستا بھی ملے گا۔ مال بھی وہاں کا پائیدار ہے۔"

ہم نے کہا "اچھا پھر وہیں چلیں۔"

دکان دار نے فوراً لمبے چوڑے پلنگ پوش سامنے لاکر پھیلا دیے ہم نے کہا ان کا ہدیہ۔
بولے " لاجواب چیز ہے۔ آپ سے پچاس تومان لے لیں گے۔"
ہم نے کہا " میں پندرہ تومان حاضر کر سکتا ہوں۔"
بولے " واہ آغا خوب داد دی ذرا اس کی بوٹی تو دیکھیے کتنی عمدہ ہے۔ چالیس تومان میں قریب قریب مفت ہے ارے میرے منہ سے چالیس نکل گیا؛ خیر نکل گیا تو ۴۰ تومان ہی سہی باندھ دوں؟"
ہم نے کہا " نہیں جناب ہمارے پاس اتنا زر نہیں ہے۔ ۱۵ تومان بھی ہمارے منہ سے جلدی نکل گیا یہ دیکھیے ادھر دھاگے نکل رہے ہیں۔ ۱۲ تومان سے زیادہ نہیں دوں گا۔
بولے " اچھا ہم آپ سے ۳۵ لے لے گا۔"
ہم نے کہا " نمی باشد یعنی گھر بیٹھو۔"
بولے " ۳۰ "
ہم نے کہا " بارہ، وہ بھی تمہارا دل رکھنے کے لیے ورنہ انصاف سے یہ چادر دس تومان کی ہوتی ہے۔"
بولے " تم نے پندرہ تومان قیمت لگائی تھی نا؟ اب دس پر آ گئے۔"
ہم نے کہا " ایک کی نہیں، دو کی لگائی تھی خیر اسے ہٹائیے ہمیں یہ درکار نہیں۔ یہ میز پوش کتنے کا ہے۔"
اب دکان دار بڑی سے بڑی چیز نکال کر دکھاتا تھا۔ ہم چھوٹی سے چھوٹی چیز پر ہاتھ رکھتے تھے۔ اس نے ایک بڑا خوان پوش نکالا۔ ہم نے نظریں ادھر سے گھما کر ایک ۸ انچ مربع کا رومال پسند کیا۔ جس پر شیخ سعدی بیٹھے حقہ پی رہے تھے وہ تانبے کا ایک طشت اٹھا کے لایا۔ ہم نے ایش ٹرے پسند کی۔ اس نے ایک قالین پھیلایا۔ ہم نے ایک چھوٹا سا بٹوہ اٹھایا۔
قصہ مختصر یہ کہ ہم نے دس دس آنے والے آٹھ رومال خرید ہی لیے۔ یہی نہیں بلکہ ایک جزدان نما کپڑے کا بیگ بھی لے لیا پانچ چھ روپے کا۔ ایک لیڈیز ہینڈ بیگ بھی چھپے ہوئے خاکی کپڑے کا اتنے میں مل گیا جس پر فردوسی کی تصویر تھی۔ کم از کم اس تصویر میں مرحوم کی شکل بالکل مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملتی تھی۔
مرتضیٰ نے کہا " اب کچھ مٹھائی ضرور لے لو۔ اصفہان کا تحفہ ہے۔ لے لو یہ حلوائی ہماری پہچان کا ہے۔ میاں ان صاحب کو ذرا دو تین کیلو گز تو دے دینا۔"
ہم نے کہا " گز کیا؟"
ایک قند کی بھیلی اٹھا کر دکھائی " یہ گز کہلاتی ہے مزے کی چیز ہے۔"
ہم نے کہا " ہم مٹھائی نہیں کھاتے دانت خراب ہوتے ہیں۔"

بولے "نہیں ہوتے۔"

ہم نے کہا "ہوتے ہیں۔"

بولے "ہماری یادگار کے طور پر لے جایئے۔"

ہم نے کہا "نا صاحب یہ گز ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمارے تو جاڑے کی میوہ گزک ہوتی ہے۔ جسے ہم گجک کہتے ہیں۔"

بولے "تو پھر یہ لو" اشارہ کچھ لڈو نما مٹھائی کی طرف تھا۔

ہم نے کہا "نہ آغا ہمیں اس مٹھائی سے معاف رکھو۔"

اتنے میں ہمیں ایک دکان پر سلیپر نظر آئے۔ یوں تو ہم کراچی میں لوگوں سے کیا کیا نہ لانے کے وعدے کر کے آئے تھے۔ ریڈیو، سنگر مشین، رفریجریٹر، زعفران، زیرہ وغیرہ لیکن جس نے بہت کسر نفسی سے کام لیا، اس نے بھی سلیپر لانے کی فرمائش ضرور کی تھی۔ سامنے ایک دکان پر بیسیوں سلیپر رکھے نظر آئے۔ یہ ایک خاص طرح کے زنانہ جوتے ہوتے ہیں جن پر رنگ برنگی مخمل سی منڈھی ہوتی ہے۔ دکان دار نے کہا "جناب پندرہ پندرہ تومان کا مال آپ کی آمد کی خوشی میں دس دس تومان کا لگا دیا ہے۔ بالکل مفت ہے کیوں کہ دکان کا دیوالیہ نکالنا مقصود ہے۔ کتنے جوڑے دے دوں پندرہ یا بیس؟"

ہم نے کہا "ایک جوڑا کافی ہے اگر ۷ تومان پسند ہوں تو زہے عزو شرف۔"

بولے "ہاں پسند ہیں جلدی نکالیے۔"

بازار کو سلام کر کے باہر نکلے۔ ہم نے مرتضیٰ نکوئی سے پوچھا اب؟ ابھی ہمیں چہل ستون بھی دیکھنا ہے اور جامع مسجد بھی۔

بولے اس وقت تو وہ بند ہو گئیں سہ پہر میں دیکھیے گا۔ اب چلیے کھانا کھائیں؟

ہم نے کہا "ہم تو کھانا نہیں کھاتے۔"

بولے "کیوں کیا آپ بیمار ہیں؟"

ہم نے کہا "نہیں خدانخواستہ، بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں دوپہر کا کھانا کھانے کا رواج نہیں۔"

ہمارا ارادہ اب یہ تھا کہ ۵ تومان ان کی محنت کا معاوضہ کسی بہانے دے کر رخصت کر دیا جائے ورنہ اس کی تسمہ پائی سے نقصان بھی ہوگا اور لطف بھی غارت ہوگا۔

بولے "آپ ڈکشنری پڑھتے ہیں؟"

ہم نے کہا "نہیں پڑھتے تو نہیں، ہاں ڈکشنریاں دیکھی ضروری ہیں۔ کبھی کوئی مشکل لفظ آیا دیکھ لیا۔"

بولے "میں اسے باقاعدہ پڑھنا چاہتا ہوں تاکہ میری انگریزی مضبوط ہو اور مجھے انگریزی کے سارے الفاظ یاد آجائیں۔"

ہم نے کہا "وہ تو سوائے خدا کی ذات کے کسی کو نہ آتے ہوں گے۔"

بولے "ایک شخص حییم ہے اس کو آتے ہیں۔ اس نے کئی ڈکشنریاں بنائی ہیں۔ انگریزی سے فارسی کی بھی، فارسی سے انگریزی کی بھی، میں سوچتا ہوں کتنا بڑا عالم ہوگا۔"

ہم نے کہا "ڈکشنری بنانے کا طریقہ ہمیں معلوم ہے اس کے لیے سارے الفاظ جاننے ضروری نہیں ہوتے۔"

بولے "میں بڑی بڑی مشکل کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ یہاں میں نے ایک دکان پر بڑی بڑی اچھی ڈکشنریاں دیکھی ہیں لیکن افسوس خرید نہیں سکتا۔"

گویا حسنِ طلب شروع ہوا۔ ہم نے کہا "ایک دکان کی کیا تخصیص، ڈکشنریاں تو ہر دکان پر ملا کرتی ہیں۔ آج بازار میں ایک بک سٹال پر ہم نے دیکھی تھیں۔"

بولے "اس دکان پر بہت عمدہ ہیں اور کافی ذخیرہ ہے آپ کو دکھاؤں۔"

ہم نے کہا "نہیں اس وقت جی نہیں چاہتا۔"

بولے "مجھے ایک لے دیجیے راستے ہی میں دکان ہے۔"

دکان راستے ہی میں تھی اور دکان دار نے باقی گاہکوں کو نظر انداز کر کے اور مرتضیٰ نکوئی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ہمیں اندر بلا لیا اور کہا یہ دیکھیے ساری ڈکشنریاں موجود ہیں۔

مرتضیٰ نکوئی کے حوصلے بہت بلند تھے۔ اس نے ایک نور اللغات کے حجم کی لغت اٹھا کر کہا یہ اچھی ہے اس میں سارے ہی لفظ شامل ہیں۔

"کتنے کی ہے۔"

بولے "دو سو تومان کی ہے۔"

ہم نے ان کے ہاتھ سے لے کر واپس شیلف میں رکھ دی۔

انھوں نے اب اس سے چھوٹی لغت اٹھائی۔

"یہ پچاس کی ہے۔"

وہ بھی ہم نے ان کے ہاتھ سے لے کر شیلف میں ٹکا دی۔

ایک اس سے چھوٹی تھی۔ بولے۔

"یہ اتنی اچھی تو نہیں۔ لیکن گزارہ ہے۔"

ہم نے کہا "کتنے کی؟"

بولے "فقط بیس تومان کی ہے لے لوں!"

ہم نے کہا "دیکھو میاں مرتضیٰ نکوئی۔ ہمیں سیٹھ ساہوکار مت سمجھو۔ ہم ہیں ۲۰ تومان بھی خرچ کرنے کی تاب نہیں۔ تمھیں زیادہ سے زیادہ یہ ڈکشنری لے کر دے سکتا ہوں یا پھر یہ۔"

ان میں سے ایک ۵ تومان کی تھی دوسری سات کی۔

اب انھوں نے ایک اور اٹھائی اور بولے "یہ ۱۲ تومان والی بھی چل جائے گی۔"

ہم نے کہا "انگریزی کا کوئی ایسا لفظ بولو جو اس پانچ تومان والی میں نہ ہو۔"

یہ منہ لٹکا کے بولے "خیر سات تومان والی لیے لیتا ہوں۔"

اب ہم دکان دار سے مخاطب ہُوئے "میاں یہ کتنے کی ہوگی۔ صحیح بتاؤ سات تو ہم دینے سے رہے"۔ بولے "جی سات تومان ہی ہوں گے۔ کمپنی کی قیمت لکھی ہوئی ہے اور ہمارے ایک دام ہیں"۔

خیر کچھ وہ گھٹا کچھ ہم بڑھے چھ تومان میں سودا ہو گیا۔

باہر نکل کر کہا "اچھا میاں مرتضیٰ نکوئی خدا حافظ، پھر ملیں گے اگر خدا لایا"۔

بولے "تو آپ چہل ستون، مینار لرزاں، جامع مسجد خود دیکھ لیں گے"۔

ہم نے کہا "ہاں اور پھر ہم تمھارا قیمتی وقت ضائع نہیں دیکھنا چاہتے، تم پھر مسجد شاہ واپس جاؤ۔ کوئی اور گانٹھ کا پورا تلاش کرو"۔

بولے "یہ میرا کارڈ لیجیے اور مجھے بھولیے نہیں"۔

ہم نے کہا "بھولنا کیا معنی۔ واپس جا کر ہو سکا تو تمھارے بارے میں لکھیں گے بھی۔ تمھیں کوئی بھول سکتا ہے؟"

ہم نے ہاتھ ملا کر مرحمتِ شما زیاد کہہ کر خیابان چہار باغ کی طرف قدم اٹھایا۔ مرتضیٰ وہیں کھڑا رہا۔ چالیس قدم ادھر ایک غباروں والوں کی دکان تھی وہاں ٹھٹھک کر ہم نے سوچا دیکھیں تو مرتضیٰ نکوئی اب کیا کرتے ہیں؟

مرتضیٰ نکوئی دوبارہ کتاب فروش کی دکان میں گھسا اور چند لمحے کے بعد باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ڈکشنری نہ تھی۔

خدا جانے اس دکان پر حییٔم کی ڈکشنریوں کے ایسے کتنے سودے ہوتے ہوں گے۔ ہم تو خیر پاکستانی ہیں اور طبیعت کے جزرس کہ چھ تومان میں یہ آزار ٹالا۔ دو سو تومان نہ سہی ۲۰ تومان کی ڈکشنری خرید کر دینے والے بہت ہیں۔ اسے واپس لے کر دکان دار ایک دو تومان اپنا حصہ لے لیتا ہوگا باقی نقد مرتضیٰ نکوئی کی جیب میں جاتے ہوں گے۔

سو یہ تھے مرتضیٰ نکوئی۔

اب دوپہر تھی اور کڑاکے کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ ہوٹل جانے کا کچھ فائدہ نہ تھا۔ رہنے کی تو مجبوری ہے کھانا آپ کہیں بھی کھایئے وقت ایسا تھا کہ آدھ گھنٹے کے بعد دیکھنے کے مقامات چہل ستون وغیرہ پھر دیکھنے والوں کے لیے کھلنے والے تھے۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر ہم پھر داہنے ہو لیے۔ تھوڑی دور قیمے کی سوندھی خوشبو آئی جو بھوک کو چمکا گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا بھٹیار خانہ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ باورچی زیتون کے تیل کا چمچ (چمچہ نہیں) ایک بہت بڑے فرائی پین میں ڈال کر قیمہ بھونتا ہے اور پھر نان کو اسی روغن میں تل اوپر سے قیمہ ڈال گاہکوں کو پروس رہا ہے۔ ایک طرف لسی کا لال ماٹ رکھا تھا۔ یوں کوکا کولا اور کناڈا ڈرائی کا انتظام بھی تھا۔ بھٹیار خانے کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں کرسی میز نہ تھی۔ سب کچھ تھا۔ بوائے نے فوراً پیاز اور چٹنی سامنے لا فرمایا۔ "بفرمائید آقا۔"

ہم نے کہا "روٹی قیمہ اور لسی۔"

قیمہ تو خیر، روٹی کا سائز اچھی خاصی ٹوکری کے برابر تھا۔ ہم نے کہا "اس سے آدھا" اس نے تعمیل ارشاد کی۔ ہم نے کہا "اس سے بھی آدھا۔"

یہ پارۂ نان بھی ہمارے ظرف سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ لیکن سوچا کوئی مضائقہ نہیں۔

معلوم ہوا کہ اگر اسی فٹ پاتھ پر دو سو قدم آگے جائیں تو داہنے ہاتھ ایک رستہ مڑے گا۔ وہ ایک چوک پر پہنچائے گا۔ وہاں سے بائیں ہاتھ مڑیں تو جامع مسجد کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے کسی سے پوچھ لیجیے بلکہ خود ہی ڈھونڈ لیجیے۔

# مشق

۱۔ مصنف نے اصفہان کی مسجد شاہ کے بارے میں کیا تفصیل بیان کی ہے؟

۲۔ مرتضیٰ نکوئی مصنف کو جلد از جلد بازار کیوں لے جانا چاہتا تھا؟

۳۔ "یہ سارا فلسفہ مرتضیٰ نکوئی کی سمجھ میں نہ آیا، جس سے گمان ہوتا تھا کہ امریکن سکول میں پڑھتا ہے"۔ اس جملے کا سیاق و سباق کے حوالے سے جائزہ لے کر بتایئے کہ مصنف نے اس میں کیا بات کہی ہے؟

۴۔ اسی مضمون میں اصفہان میں خرید و فروخت اور سودے بازی کا کیا رنگ بیان کیا گیا ہے؟

۵۔ مرتضیٰ نکوئی نے ڈکشنری کی خرید کا تقاضا کس طرح کیا؟ کیا واقعی ڈکشنری مطلوب تھی؟ اگر نہیں تو وہ اس کا کیا کرتا تھا؟

۶۔ اس مضمون سے مصنف کی مردم شناسی اور کردار کے بارے میں آپ نے کیا اندازہ لگایا؟

۷ - آپ کو کبھی کسی ایسے شہر کی سیر کا موقع ملا ہو جہاں آپ پہلی بار گئے ہوں، تو ناواقفیت میں کچھ واقعات پیش آئے ہوں گے۔ ایسے واقعات پر مشتمل اپنی سیر کے احوال پر ایک مضمون لکھیے۔

۸ - انھیں اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ معنی واضح ہو جائیں۔

تسمہ پائی، غارت ہونا، گانٹھ کا پورا، حسن طلب، جزرس طبیعت، سوندھی خوشبو، ماتھا ٹھنکنا، طغرہ باکفایت، پرو سنا۔

۹ - اس سبق سے اسمِ ظرفِ مکان تلاش کر کے لکھیے۔

۱۰ - ان میں سے مذکر و مونث الفاظ الگ الگ کیجیے۔

حجرہ، تالار، محراب، مدرسہ، بازار، مسجد، ٹکٹ، کارخانہ، دکان، عمارت، چادر، رومال، بٹوہ، زعفران، وقت، قیمہ، روٹی، لسی، دُودھ۔

۱۱ - اس سبق میں سے مرکباتِ توصیفی تلاش کر کے لکھیے۔

۱۲ - جمع کے واحد اور واحد کے جمع لکھیے۔

خواتین، مدرسہ، مسجد، ظروف، تحفہ، عالم، لغت، باغ۔

# کلیم اور مرزا ظاہر دار بیگ

## نذیر احمد

(درج ذیل اقتباس ڈپٹی نذیر احمد کے مشہور ناول "توبتہ النصوح" سے لیا گیا ہے۔ کلیم ایک کھاتے پیتے گھرانے کا نفیس مزاج کا نوجوان ہے۔ اس کا سارا وقت شاعری کرنے اور دوستوں کی محفل میں گپ شپ میں گزرتا ہے۔ اس کے والد نصوح اس کی اصلاح چاہتے ہیں۔ وہ اسے بار بار تلقین کرتے ہیں کہ وہ نماز روزے کی پابندی کرے اور اپنی عادات کی اصلاح کرے۔ گھر کے دوسرے افراد بھی نصوح کے ہم خیال ہیں۔ کلیم اپنے والد کی باتوں کو فرسودہ تصوّر کرتا ہے۔ اس طرح اختلاف بڑھتے جاتے ہیں۔ بالآخر ایک دن تلخی کے نتیجے میں کلیم گھر چھوڑ دیتا ہے۔ اُسے یہ زعم تھا کہ گھر والے اسے منا کر لے آئیں گے اور اگر انھوں نے فوری طور پر ایسا نہ بھی کیا تو دو چار روز جب وہ کسی دوست کے یہاں گزارے گا تو گھر والے پچھتاتے ہوئے اسے ڈھونڈتے پھریں گے۔ اس کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا اور یہ لوگ اکثر اس کے گرد جمع رہتے تھے۔ اس نے گھر سے نکل کر مرزا ظاہر دار بیگ کے یہاں جانا پسند کیا جو اس کے حواریوں میں سے تھے اور امارت کے قصے سناتے رہتے تھے)

قصہ کوتاہ کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہُوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی ست رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکمے، بے فکرے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد، اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا، وہ بھی حقیقی نہیں، ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب رزیڈنٹ[1] کی اردلی کا جمعدار[2] تھا۔ اول تو ایسی

---

۱۔ سرکار کمپنی بہادر (یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی) کی حکومت کا ابتدائی زمانہ جب دہلی اور شمالی ہند کے علاقے پہلے پہل انگریزوں کے تسلط میں آئے تھے اور دہلی میں کمپنی کی طرف سے انگریز ریزیڈنٹ حکومت کرتا تھا۔

۲۔ پہلے یہ لفظ اپنی اصل صورت میں "جماعہ دار" لکھا جاتا تھا۔ اس کتاب کے ابتدائی نسخوں میں اسی طرح ہوا ہے۔

عالی جاہ سرکار، دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار، تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی ۔ اس پر خود اس کی رشوت ستانی، بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد دلی کی رو داروں میں ہوگیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہوگئی۔ جمعدار نے، باوجودے کہ دور کی قرابت تھی، حسبتہ اللہ اس کا تکفل اپنے ذمے لیا۔ جمعدار اپنی حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے، پوتے، نواسے کثرت سے تھے، انھوں نے بے اعتنائی کی اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے مگر ان کے ورثا نے بہ ہزار دقت، محل سرا کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا، اور سات روپے مہینے کے کرائے کی دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی، تین تین آدمی اور سات روپے کی کل کائنات، اس پر مرزا کی شیخی اور نمود۔ یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے، جن کو صدہا روپے ماہوار کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے مگر یہ بے غیرت زبردستی ان میں گھستا تھا۔ کسی کو ماموں جان، کسی کو بھائی جان، کسی کو خالو جان بناتا اور وہ لوگ اس کے ادعائی رشتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا ان کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں، مگر امیرزادگی نہ تھی تو کیسے نبھے۔ دکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بے چاری بہتیرا بکتی مگر کون سنتا تھا۔

مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے[۳] کی جوتی، سر پر دہری بیل کی بھاری کام دار ٹوپی، بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے، اوپر شبنم یا ہلکی سی تن زیب، نیچے کوئی طرح دار ساڈھاکے کا نینو[۴]۔ جاڑا ہوا تو بانات مگر سات روپے گز سے کم کی نہیں۔ خیر یہ تو صبح و شام اور تیسرے پہر کاشانی مخمل کی آصف[۵] خانی جس میں حریر کی سنجاف[۶] کے علاوہ گنگا جمنی کم خواب[۷] کی عمدہ بیل ٹنکی ہوئی۔ سرخ نیفہ، پاجامہ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار اور قدرے نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے، اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں، اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا، ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا، اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔

---

۳ - ایسا جوتا جس میں بہ نسبت عام جوتوں کے زری کے کام کا حاشیہ ڈیوڑھا چوڑا ہو۔
۴ - ڈھاکے کا مشہور ململ۔
۵ - آصف خانی: نیم آستین صدری۔
۶ - حریر کی سنجاف: ریشم کی گوٹ۔
۷ - کم خواب: بھاری کام دار کپڑا جو سنہری روپہلی بیل بوٹوں سے لپا ہوا ہوتا ہے۔ گنگا جمنی نقرئی و طلائی یا سنہری اور روپہلی۔

کلیم سے اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویا یک جان و دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا، شام کو تو کبھی کبھی، لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا، اور وہ جمعدار کی محل سرا کو مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا۔ اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محل سرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں، اور ان میں سے ایک نے پوچھا "کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟"

کلیم: "جاؤ مرزا کو بھیج دو۔"

لونڈی: "کون مرزا؟"

کلیم: "مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے اور کون مرزا۔"

لونڈی: "یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کر لے کہ کلیم نے کہا: "کیوں جی یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے؟"

لونڈی: "ہے کیوں نہیں۔"

کلیم: "پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟"

لونڈی: "جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے، موا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے۔"

دوسری لونڈی: "اری کم بخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے۔" (کلیم سے مخاطب ہو کر) "کیوں میاں! وہی ظاہر دار بیگ نا، جن کی رنگت زرد زرد ہے، آنکھیں کرنجی، چھوٹا قد، دبلا ڈیل، اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔"

کلیم: "ہاں ہاں وہی ظاہر دار بیگ۔"

لونڈی: "تو میاں، اس مکان کے پچھواڑے اوپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے وہ اس میں رہتے ہیں۔"

کلیم نے وہاں جا آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ، جانگیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے: "آہا! آپ ہیں - بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں - میں ذرا کپڑے پہن کر آؤں تو آپ کے ہم رکاب چلوں"

کلیم: "چلیے گا کہاں؟ میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا"

مرزا: "پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں"

کلیم: "میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں"

مرزا: "بسم اللہ، تو چلیے اسی مسجد میں تشریف رکھیے، بڑی فضا کی جگہ ہے - میں ابھی آیا"

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے، وہ بھی مسجد ضرار[۸] کی طرح ویران، وحشت ناک، نہ کوئی حافظ ہے نہ ملا، نہ طالب علم، نہ مسافر - ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں - فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے -

مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا - مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا - قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے، مرزا صاحب بطور دفع دخل مقدر[۹] فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے، خفقان کا عارضہ، اختلاج قلب کا روگ ہے - اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا اس وجہ سے دیر ہوئی، پہلے یہ تو فرمائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟"

کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار، تمام ماجرا کہہ سنایا -

مرزا: "پھر اب ارادہ کیا ہے؟"

کلیم: "سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے، اور جو آپ کی صلاح ہو"

مرزا: "خیر نیت شب حرام صبح تو ہو - آپ بے تکلف استراحت فرمائیے - میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیمار داری کے لیے اجازت دیجیے کہ آج اس کی علالت میں اشداد ہے"

کلیم: "یہ کیا ماجرا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دہری محل سرائیں، متعدد دیوان خانے، کئی پائیں باغ ہیں - حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دکانیں اور سرائیں، میں تو جانتا ہوں کہ عمارت کی قسم سے کوئی

---

۸ - وہ مسجد جسے منافقین نے مسلمانوں کو ضرر پہنچانے کے لیے (ضراراً) تعمیر کی تھی - اللہ تعالےٰ نے اس سازش سے آگاہ فرما دیا (سورۂ ۹ آیت ۱۰۷) اور یہ مسجد ڈھا دی گئی -

۹ - پیش بندی کرتے ہوئے شکایت سے پہلے عذر کرنا -

چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی مِلک نہ بتایا ہو، یا یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لیے تم کو جگہ میسّر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کیے ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ تمام تر کے پر تم قابض اور متصرف ہو۔ لیکن میں اس تمام جاہ وحشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھتا۔"

مرزا: "آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے آپ سے صحبت رہی، مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلاف حالت جو آپ دیکھتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے۔ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنّیٰ کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں دُور بھاگتا ہے۔ صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ، بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہُوئی ہے، اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منا لے جائیں۔"

کلیم: "لیکن آپ نے اس کا تذکرہ کبھی نہیں کیا۔"

مرزا: "اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلالِ مزاج سے بے بہرہ اور غیرت وحمیّت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے اجازت دیجیے کہ میں جا کر بچھونا بھجوا دوں اور مریضہ کی تیمار داری کروں۔"

کلیم: "خیر، مقام مجبوری ہے۔ لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجیے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔"

مرزا: "چراغ کیا میں نے تو لمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن ہیں، پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جیے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجیے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔"

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہُوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں ہی گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا، کیوں کہ اوّل تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی، دوسرے یہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجے کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس بات سے معترض نہ ہوا، اور کلیم بے چارے کا یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قُل ھُو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی

طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عن قریب تمام شب کے واسطے رخصت ہُوا چاہتا ہے، تو بے چارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ سنو یار، میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا: "سچ کہو! نہیں جھوٹ، بہکاتے ہو۔"

کلیم: "تمھارے سر کی قسم، میں بھوکا ہوں۔"

مرزا: "تو مردِ خدا، آتے ہی کیوں نہیں کہا؟ اب اتنی رات گئے کیا ہوسکتا ہے۔ دکانیں سب بند ہوگئیں اور جو دو ایک کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی، جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ گھر میں آج آگ تک نہیں سلگی۔ مگر ظاہراً تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دیوِ اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرما گرم خستہ چنے کی دال بنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھ کو تم کو دونوں کو کافی ہوگی رات کا وقت ہے۔"

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگا لیے، اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا: "یار، ہو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا، واللہ ہاتھ تو لگاؤ، دیکھو تو کیسے بھلس رہے ہیں، اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجب ہی دل فریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا، تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو، کمال بھی کیا چیز ہے۔ دیکھیے اتنی تو رات گئی ہے مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہُوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا تھا۔ اور واقع میں آپ ذرا غور سے دیکھیے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمھیں میرے سر کی قسم سچ کہنا ایسے خوب صُورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں، ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور۔ اور دانوں کی رنگت دیکھیے۔ کوئی بسنتی ہے، کوئی پستئی، غرض دونوں رنگ خوش نما۔ یوں تو صدہا قسم کے غلے اور پھل زمین سے اگتے ہیں لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سنی ہے؟"

کلیم: "فرمائیے۔"

مرزا: "چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو ارزاقِ عباد کا اہتمام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جوں ہی میں نے سر زمین سے نکالا تیرِ ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں

مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی اور پر نہیں ہوتے۔ نشو ونما کے ساتھ میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں۔ جب ذرا بارور ہُوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکری بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کیے۔ پکا تو شاخ و برگ بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ، اس کو چکی میں دلیں، گھوڑوں کو کھلائیں، بھاڑ میں بھونیں، بیسن بنائیں، کھولتے ہوئے پانی میں ابالیں، گھنگھنیاں پسائیں، غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح پر بے باکانہ چٹر پٹر بولنا سُن کر حاضرین دربار اس قدر ناخوش ہُوئے کہ ہر شخص اسے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظار حکم اخیر رخصت ہُوا۔ سو حضرت یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندان آز بھی ان پر تیز ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا ورنہ میر مدو کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں ؟"

غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی، اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے۔ مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہونا عبرت کا مقام ہے۔ یا تو خلوت خانہ اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آ کر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا تھوڑا سا حال ہم نے اوپر بیان کیا۔ گھر کے الوان نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ، نہ چارپائی، نہ بہن نہ بھائی، نہ مونس نہ غم خوار، نہ نوکر نہ خدمتگار مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہہ گار، یا قفس میں مرغِ نو گرفتار اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہہ پکڑتا، اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا، اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجردم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوجھنے کو تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔

صبح ہوتے آنکھ لگ گئی، تو نہیں معلوم مرزا یا محلے کا کوئی اور عیار ٹوپی، جوتی، رومال، چھڑی، تکیہ، دری، یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی، لے کر چمپت ہوا۔ یوں بھی کلیم بہت دیر کو سو کے اٹھتا تھا اور آج تو ایک وجہ خاص تھی، کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرش مسجد پر پڑا ہے، اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبھوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہُوا کہ قلبِ ماہیت ہو کر میں کہیں بھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو ادھر دیکھا ادھر دیکھا کہیں پتا نہیں۔ مسجد تھی ویران، اس میں پانی کہاں صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آ نکلے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منہ ہاتھ دھو کر خودِ مرزا تک جاؤں۔ اس میں دوپہر ہونے آئی۔ بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا۔ جونہی زینے پر چڑھا کہ کلیم اس سے عرض

مطلب کرنے کے لیے لپکا - وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر بھاگا - خدا جانے اس نے اس کو بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا - کلیم نے بہتیرا پکارا اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔

ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو الو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا - سیدھا مرزا کے مکان پر گیا اور آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں - کلیم نے چاہا کہ تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو منہ ہاتھ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پرانی ٹوپی اور جوتی، تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے - یہ سوچ کر اس نے کہا: "کیوں حضرت، آپ مجھ سے بھی واقف ہیں؟"

اندر سے آواز آئی: "ہم تمھاری آواز تو نہیں پہچانتے، اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔"

کلیم: "میرا نام کلیم ہے، اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے بلکہ شب کو میں مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔"

گھر والے: "وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو رات تمھارے سونے کے لیے بھیجا گیا تھا؟"

تکیہ اور دری کا نام سن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متامل تھا کہ اندر سے آواز آئی: "مرزا زبردست بیگ! دیکھنا، یہ مردوا کہیں چل نہ دے - دوڑ کر تکیہ دری تو اس سے لو۔"

کلیم یہ سن کر بھاگا - ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست نے 'چور چور' کر کے جالیا - ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کیے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر، اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا - کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سنا اور کلیم سے اس کا حسب نسب پوچھا۔

ہر چند کہ کلیم اپنا پتا بتانے میں جھینپتا تھا مگر چار و ناچار اس کو بتانا پڑا - لیکن اس کی حالت ظاہری ایسی ابتر ہو رہی تھی کہ اس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا - کوتوال نے سن کر یہی کہا کہ میاں نصوح جن کو تم اپنا والد بتاتے ہو میں ان کو خوب جانتا ہوں اور یہ بھی مجھ کو معلوم ہے کہ ان کے بڑے بیٹے کا یہی نام ہے جو تم نے اپنا بیان کیا ہے محلے کا پتا، گھر کا نشان بھی جو تم نے کہا سب ٹھیک ہے - مگر کلیم تو ایک مشہور و معروف آدمی ہے - آج شہر میں اس کی شاعری کی دھوم ہے - تمھاری یہ حیثیت کہ ننگے سر، ننگے پاؤں، بدن پر کیچڑ تھپی ہوئی، مجھ کو باور نہیں ہوتا - اچھا اب رات کو کیا ہو سکتا ہے - جرم سنگین ہے، ان کو حوالات میں رکھو صبح ہو میں ان کے والد کو بلواؤں تو ان کے بیان کی تصدیق ہو۔

کلیم یہ سن کر رو دیا اور کہا کہ میں وہی بدنصیب ہوں جس کی شعر گوئی کا شہرہ آپ نے سنا ہے - آپ کو یقین نہ ہو تو میں اپنے افکار تازہ آپ کو سناؤں - چنانچہ کل شب کو جو کچھ مسجد و مرزا کی شان میں کہا تھا سنایا - اس پر کوتوال نے اتنی رعایت کی کہ دو سپاہی کلیم کے ساتھ کیے اور ان کو حکم دیا کہ ان کو میاں نصوح کے پاس لے جاؤ - اگر وہ ان کو اپنا فرزند بتائیں تو چھوڑ دینا، ورنہ واپس لا کر حوالات میں رکھنا۔

# مشق

۱ - نذیر احمد نے مرزا ظاہر دار بیگ کا جو سراپا بیان کیا ہے اسے اپنے لفظوں میں لکھیے۔
۲ - کلیم نے جب مرزا سے مسجد میں ٹھہرائے جانے کی شکایت کی تو اس نے کیا جواب دیا؟
۳ - مسجد میں روشنی نہ کرنے کا مرزا نے جو جواز پیش کیا اس کی معقولیت پر رائے دیجیے۔
۴ - مرزا نے چنوں کی تعریف میں جو کچھ کہا اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔
۵ - اس کہانی سے آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟
۶ - درج ذیل عبارتوں کی تشریح کیجیے:-

(الف) "کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے، وہ بھی مسجد ضرارہ کی طرح ویران، وحشت ناک، نہ کوئی حافظ ہے نہ ملا، نہ طالب علم نہ مسافر، ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھر بنجے کا فرش بن گیا ہے۔"

(ب) "دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہونا عبرت کا مقام ہے۔ یا تو خلوت خانہ اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آکر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا تھوڑا سا حال ہم نے اوپر بیان کیا۔ گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی، نہ بہن نہ بھائی، نہ مونس نہ غم خوار نہ نوکر نہ خدمت گار، مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہگار۔ یا قفس میں مرغ نو گرفتار۔ اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہہ پکڑتا، اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا اور اسی وقت نہیں تو گجر دم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا۔

۷ - کہانی کا یہ اقتباس نذیر احمد کے ناول توبۃ النصوح سے لیا گیا ہے۔ لائبریری سے یہ ناول حاصل کر کے پڑھنے کی کوشش کیجیے۔

# پریوں کا غول

عبدالحلیم شرر

(درج ذیل اقتباس عبدالحلیم شرر کے مشہور ناول "فردوس بریں" کے پہلے باب سے لیا گیا ہے۔ اس اقتباس سے قبل کے واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۲۵۶ء میں بحر خذر کے جنوبی ساحل سے شروع ہو کر کوہسار طالقان سے گزر کر قزوین جانے والی پُرخطر سڑک پر ایک نوجوان مرد اور لڑکی سفر کر رہے ہیں۔ اس علاقے سے دیووں اور پریوں کے قصے وابستہ ہیں اور فرقہ باطنیہ کے خوف سے لوگ اس علاقے میں سفر سے گریز کرتے ہیں۔ علاقے کے مناظر بہت خوبصورت ہیں۔ شام کا وقت قریب ہوتا جا رہا ہے اور یہ دو نوعمر مسافر محوِ سفر ہیں)

یہ دونوں نوعمر مسافر چاروں طرف کے منظروں کو دیکھتے ہیں اور مقامی دشواریوں کی وجہ سے دل ہی دل میں ڈرتے ہوئے بڑھے جاتے ہیں۔ دن کے آخر ہو جانے کے خیال سے ان کے نازک چہرے جنھوں نے ابھی تک تجربے کی پختگی نہیں حاصل کی، پریشان ہونے لگے ہیں مگر اس پر بھی خموشی کا قفل نہیں کھلتا۔ ناگہاں کسی فوری جذبے سے مغلوب ہو کے نازنین نے ٹھنڈی سانس لی اور باریک دلفریب آواز میں پوچھا "آج کون سا دن ہے؟"

نوجوان: (چپکے ہی چپکے حساب لگا کر) جمعرات۔

لڑکی: (حسرت آمیز لہجے میں) تو ہمیں گھر چھوڑے آج پورے آٹھ دن ہوئے۔ (ذرا تامل کر کے) خدا جانے لوگ کیا کیا باتیں بناتے ہوں گے اور کیسی کیسی رائیں قائم کی جاتی ہوں گی۔

نوجوان: یہی کہتے ہوں گے کہ حج کے شوق نے ہم سے وطن چھڑا دیا۔

لڑکی: (پھر ایک آہ سرد بھر کے) مجھے الزام بھی دیتے ہوں گے کہ نامحرم کے ساتھ چلی آئی۔

نوجوان: زمرد! (اس لڑکی کا نام ہے) اب میں نامحرم نہیں ہوں۔ دو ہی چار روز میں ہم قزوین پہنچ جائیں گے اور وہاں پہنچتے ہی نکاح ہو جائے گا۔

زمرد: (پھر ٹھنڈی سانس لے کر) خدا جانے وہاں پہنچنا بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں؟

نوجوان: کیوں؟

زمرد: راستے کی دشواریاں تو مشہور ہی ہیں۔ کوئی خوش نصیب مسافر ہوتا ہوگا جو پریوں کے ہاتھ سے بچ کر نکل جاتا ہو اور ان سے بچ بھی جائے تو ملاحدہ کیوں چھوڑنے لگے۔

زمرد میں اس وقت ایک غیر معمولی تغیر پیدا ہوگیا ہے۔ اس مقام نے اسے کوئی خاص بات یاد دلا دی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ چاروں طرف کے منظر کو ہر طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہی ہے اور بار بار سرد آہ بھرتی ہے۔

نوجوان نے اس بات کا خیال بھی نہ کیا اور معمولی لہجے میں کہنے لگا "ملاحدہ کی طرف سے تو مجھے اطمینان ہے، اس لیے کہ ان کے مشہور نقیب آمل ملا حبتہ اللہ سے مجھے ایک خط مل گیا ہے وہ خط ہمیں ایک مجرب تعویذ کا کام دے گا۔ اور اس کے پیش کرتے ہی ہم قرمطی، کے دست ستم سے نجات پائیں گے۔"

یہ باتیں کرتے کرتے دونوں نوعمر مسافر اس مقام پر پہنچے جہاں سے سڑک تو کوہسار کی بلندی پر چڑھنا شروع ہوتی ہے اور نہر اس سے جدا ہو کے دشوار گزار گھاٹیوں اور گھنی خاردار جھاڑیوں میں گھسنے کے لیے داہنی طرف مڑ گئی ہے۔ نوجوان نے اپنے گدھے کو سڑک پر آگے بڑھایا ہی تھا کہ زمرد باگ روک کر کھڑی ہوگئی اور کہا "نہیں حسین!" (یہ اس نوجوان کا نام ہے)۔

حسین: (حیرت سے زمرد کی طرف دیکھ کر) پھر کدھر؟

زمرد: جدھر یہ نہر بہہ رہی ہے۔

حسین: ادھر تو راستہ نہیں۔

زمرد: تم چلو تو سہی۔

حسین: آخر تم قزوین چلتی ہو یا کہیں اور؟

زمرد: نہیں۔ میری منزل مقصود قزوین نہیں، مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ یہ نہر کدھر گئی ہے۔

حسین: اس طرف تو پریوں کا نشیمن ہے۔

زمرد: ہونے دو۔

حسین: سنتا ہوں کوئی ادھر سے زندہ بچ کر نہیں آتا۔

زمرد: یہی میں بھی چاہتی ہوں۔

حسین نے تعجّب اور حیرت سے زمرد کی صورت دیکھی اور ایک متانت کی آواز سے کہا" اور وہ حج کی نیت کیا ہوئی؟"

زمرد: ہے مگر اپنے بھائی موسیٰ کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھ لوں تو مکہ معظمہ کا ارادہ کریں۔

حُسین : تمھارے بھائی کی قبر؟ مگر یہ کسے خبر کہ کہاں ہے؟

زمرّد : مجھے معلوم ہے، راستہ بھی جانتی ہوں اور اس مقام کو بھی۔

حُسین : (حیرت سے) تم؟ تم کیا جانو؟

زمرّد : خوب جانتی ہوں!

حُسین : کیا کبھی آئی تھیں؟

زمرّد : نہیں، مگر یعقوب جو بھائی موسیٰ کے مرنے کی خبر لایا تھا، اس سے پورا پتا دریافت کر چکی ہوں۔ پہلی نشانی تو یہ ہے کہ جہاں سے نہر سڑک سے علیحدہ ہوئی ہے، سڑک چھوڑ کے نہر کے کنارے، جانا چاہیے اور بعد کی نشانیاں آگے چل کر بتاؤں گی۔

حُسین : یعقوب کو کیا معلوم؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ان بلند اور پیچ در پیچ پہاڑوں میں کون شخص کہاں اور کیوں کر مارا گیا؟

زمرّد : تم نہیں جانتے، بھائی موسیٰ اور یعقوب دونوں ساتھ تھے، اس مقام پر پہنچ کر نہر کے کنارے کنارے کچھ دور گئے تھے کہ کوہ البرز سے پریوں کا غول اترا۔ ان کے ہاتھ سے بھائی تو مارے گئے اور یعقوب غش کھا کر گر پڑا۔ دوسرے دن جب ہوش آیا تو بھائی کی لاش پڑی پائی۔ انھیں دفن کیا، پھر قبر بنا کے اور قبر کے پاس ہی ایک چٹان پر اس کا نام کندہ کر کے واپس آیا۔

حُسین : مجھے تو غپ معلوم ہوتی ہے۔ آخر اس کا سبب کیا کہ پریوں نے یعقوب کو تو زندہ چھوڑ دیا اور تمھارے بھائی مارے گئے؟

زمرّد : اس کا سبب یہ ہُوا کہ بھائی نے ایک پری کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور یعقوب بزدل تھا، پری زادوں کو دیکھتے ہی غش کھا کر گر پڑا۔

حُسین : پھر ایسے مقام میں تو ہرگز نہیں جانا چاہیے۔

زمرّد : نہیں حسین میں تو ضرور جاؤں گی۔

حُسین : فرض کرو ہم وہاں پہنچے اور ہمارے سامنے پریاں اتریں تو؟

زمرّد : میں تو اس سے نہیں ڈرتی۔ اگر تمھیں خوف ہے تو نہ چلو۔

حُسین : تم اکیلی جاؤ اور میں نہ چلوں؟ میں جو تمھاری مُحبّت میں ہر وقت جان دینے کو تیار ہوں۔

زمرّد : حسین سنو! میں تمھارے ساتھ آئی۔ یہ مانتی ہوں کہ تم شریف ہو اور اس زمانے سے جب کہ ہم دونوں مکتب میں ایک ساتھ پڑھتے تھے مجھے تم سے مُحبت ہے۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ ایک

شریف لڑکی کو تم فقرہ دے کے گھر سے نکال لائے - میں خود اپنے شوق سے آئی ہوں - فقط اتنی امید پر کہ بھائی کی قبر پر کھڑے ہو کر دو آنسو بہاؤں گی، جب یہ مقصد پورا ہو لے گا تو حج کو چلوں گی -

حُسین : زمرد! اپنی جوانی اور کم سنی پر ترس کھاؤ اور اس ارادے سے باز آؤ -

زمرّد : نہیں یہ نہیں ہو سکتا - اس آرزو کے لیے بے عزتی گوارا کی ہے -

حُسین : (مایوسی کی آواز سے) خداوندا اگر جان ہی جانی ہے تو پہلے میں مارا جاؤں - زمرد! تیری مصیبت ان آنکھوں سے نہ دیکھی جائے گی -

زمرّد : (مسکرا کر) گھبراؤ نہیں ہم دونوں کی کشش ایک دوسرے کو کھینچ لے گی، مارے گئے تو دونوں مارے جائیں گے -

یہ کہہ کر زمرد نے اپنے گدھے کو نہر ویرنجان کی طرف موڑا، دو ہی قدم چلی ہو گی کہ حسین نے پھر روک کر کہا "زمرد ذرا صبر کرو، چلنا ہے تو کل چلنا، اب شام ہُوا چاہتی ہے، پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔"

زمرّد : بس اب چلے ہی چلو، کہیں آبادی ملنے کی امید نہیں اور جب جنگل ہی میں ٹھہرنا ہے تو یہاں وہاں دونوں جگہ برابر ہے -

حسین سے کسی طرح انکار کرتے نہ بنی - چل کھڑا ہُوا اور دل میں پس و پیش کرتا ہوا زمرد کے ساتھ کوہ البرز کی تیرہ و تار گھاٹی میں گھسا - اب دونوں آہستہ آہستہ چلے جاتے ہیں اور اس سنسان مقام کا رعب دونوں پر اس قدر بیٹھ گیا ہے کہ بالکل خاموش ہیں - جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ہیں جنگل گھنا ہوتا جاتا ہے - سردی ساعت بساعت بڑھ رہی ہے، سناٹے نے نہر کے بہنے کی آواز زیادہ تیز کر دی ہے جس سے اس مقام کے وحشت ناک منظر میں ایک ہیبت پیدا ہو گئی ہے - اب راستہ دشوار ہے، گدھوں سے اترنا پڑا - دونوں آگے پیچھے اپنے گدھے کے دہانے ہاتھ میں پکڑے چٹانوں سے بچتے اور جھاڑیوں میں گھستے چلے جاتے ہیں - آخر دیر کے سکوت کے بعد حسین نے مرعوب ہو کر کہا "بے شک پریاں ایسے ہی سناٹے کے مقام میں رہتی ہیں - انسان کیا معنی یہاں، جانور کا بھی پتا نہیں۔"

زمرّد : ہاں! اور سنتی ہوں کہ اس نہر میں اکثر جگہ پریاں نہاتی ہیں اور بال کھولے ہُوئے آپس میں کھیلتی اور چھینٹے اُڑاتی بھی نظر آ جایا کرتی ہیں -

حُسین : (چونک کر) ایں یہ سنسناتی آواز کیسی تھی؟ جیسے کوئی چیز سن سے کانوں کے پاس سے آگے نکل گئی -

زمرّد : یہ تو مشہور بات ہے کہ پریوں کے تخت چاہے اُڑتے نظر نہ آئیں مگر ان کے سن سے نکل جانے کی آواز ضرور سنائی دیتی ہے -

حُسین: یہ بھی ممکن ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی جانور تھا۔
زمرد: جانور ہوتا تو دکھائی نہ دیتا؟
حُسین: اگرچہ ابھی آفتاب غروب نہیں ہُوا ہے مگر یہاں تم دیکھ رہی ہو کہ شام سے بھی زیادہ اندھیرا ہے۔ ایسے دھندلکے میں بعض اوقات اُلو یا بڑے بڑے چمگادڑ بھی اسی طرح سناٹے کی آواز سے اڑتے ہُوئے نکل جاتے ہیں۔
زمرد: لیکن اصل میں یہ بھی وہی پری زاد ہیں جو مختلف جانوروں کی صُورت میں رات کو نکلتے ہیں۔
حُسین: ہوگا! (اتنا کہہ کے اس نے اردگرد کے سین کو وحشت اور بزدلی کی نگاہوں سے دیکھا اور نہایت پریشانی کی آواز میں کہا) شام ہُوا چاہتی ہے اور تمھارے بھائی کی قبر کا کہیں پتا نہیں۔
زمرد: مگر میں تو بھائی کی قبر تک پہنچے بغیر دم نہ لوں گی۔

یہ کہتے ہی نہایت تاریک گھاٹی نظر آئی جس میں نہر تو گئی ہے مگر دونوں جانب ایسی چکنی اور عمودی چٹانیں ہیں کہ انسان کا گزرنا بہت دشوار ہے۔ اس گھاٹی کی صورت دیکھتے ہی زمرد ایک شوق اور بے خودی کی آواز میں چلا اٹھی "ہاں دیکھو یہ دوسری علامت ہے، اسی میں سے ہو کے راستہ گیا ہے۔"
حُسین: مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ ادھر سے ہم جائیں گے کیوں کر؟
زمرد: جس طرح بنے جاؤں گی ضرور۔
حُسین: اور یہ گدھے؟
زمرّد: ان کو یہیں چھوڑ دو واپس آکے لے لینا۔

حُسین نے اس مستقل مزاجی پر زمرد کو تعجب کی نگاہ سے دیکھا، پھر گدھے درختوں سے باندھے اور دونوں چٹانوں سے چمٹتے اور ہاتھوں سے پتھروں کے سروں اور رخنوں کو پکڑتے ہوئے آگے روانہ ہُوئے۔ کوئی دو گھڑی یہ محنت کا سفر کیا ہو گا کہ گھاٹی ختم ہو گئی جس سے نکلتے ہی دونوں نے حیرت سے دیکھا کہ نہر ویرنجان اس گھاٹی سے گزر کر یکایک ایک نہایت ہی فرح بخش مرغزار میں بہنے لگی ہے۔ یہ عجب لطف کا مقام تھا، قدرت نے خود ہی چمن بندی کر دی تھی۔ شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کے تختے دُور دُور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ نغمہ سنج طیور بھی یہاں کثرت سے نظر آئے جو ہر طرف شاہدانِ چمن کے حسن و جمال پر صدقے ہوتے پھرتے تھے۔ شام ہو رہی تھی اور یہ جوش میں بھرے ہُوئے عاشقانِ شاہدِ گل اپنے معشوقوا، کو آخری الوداع کہہ رہے تھے۔ یہ سماں دیکھتے ہی زمرّد نے خوش ہو کے کہا "اب ہم اپنی منزل مقصود کو پہنچ گئے اس وادی میں بھائی موسیٰ مارے گئے اور یہیں کہیں ان کی قبر بھی ہوگی" یہ کہہ کے زمرّد ایک نازک بدن اور چست ، چالاک ہرنی کی طرح

چاروں طرف دوڑی اور ایک بڑے پتھر کے پاس ٹھہر کے چلائی "آہ یہی میرے بھائی کی قبر ہے"۔
اس کی آواز سنتے ہی حسین بھی ادھر دوڑا گیا اور دیکھا کہ ایک چٹان پر موسیٰ کا نام کھدا ہوا ہے اور اس کے قریب ہی چند پتھروں کو برابر کر کے ایک قبر کی صورت بنا دی گئی ہے۔ دونوں نے یہاں کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کی مگر زمرد کے دل پر حسرت واندوہ کا اس قدر غلبہ ہوا کہ فاتحہ کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ گر پڑی اور قبر سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ حسین نے بہت کچھ تسلی دی۔ نہر سے پانی لا کے منہ دھلایا اور سمجھانے لگا۔

زمرد: (ہچکیاں لے لے کے) حسین مجھے اپنی زندگی کی امید نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہیں مروں گی۔ ہاتھ پاؤں سن ہو رہے ہیں۔ کلیجے میں میٹھا میٹھا درد ہے اور دل بیٹھا جاتا ہے۔ مگر مرنے سے پہلے تم سے ایک وصیت ہے۔ میں مر جاؤں تو میری لاش کو بھی انھی پتھروں کے نیچے دبا دینا جن کے نیچے بھائی موسیٰ کی ہڈیاں ہیں۔

حسین: (نہایت مستقبل مزاجی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسو پی کر) یہ وصیت اگر پوری ہونے والی ہوگی تو کسی اَور کے ہاتھ سے پوری ہوگی۔ میں تمھارے بعد زندہ نہیں رہ سکتا اور جس کے ہاتھوں یہ وصیت پوری ہوگی وہ تمھارے ساتھ میری ہڈیوں کو بھی انھی پتھروں کے نیچے دبا دے گا۔

زمرد: (خوشامد کے لہجے میں) نہیں حسین، ایسا نہ کرنا، تم کو ابھی نہیں معلوم کہ مجھے کیا چیز یہاں کھینچ لائی۔ نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ بھائی کی محبت ہے اور نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ یعقوب کے بیان میں کوئی جادو تھا۔ مگر جس روز اس نے بھائی موسیٰ کی حسرت نصیب داستان سنائی اس کے دوسرے ہی دن میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے بھائی اسی وادی میں کھڑے ہیں۔ خواب ہی میں انھوں نے مجھے ہاتھ کے اِشارے سے اپنی طرف بلایا اور تاکید کر کے کہا کہ میری قبر پر آ کے فاتحہ پڑھ۔ مرحوم بھائی نے کچھ ایسی موثر وضع سے بلایا تھا کہ ان کی اُس وقت کی صورت اِس وقت تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ میں یہاں بھائی کی بُلائی ہُوئی آئی ہُوں۔

حسین: (وفورِ گریہ سے بے اختیار ہو کر اور ایک بے انتہا جوش کے ساتھ) خیر تمھیں تو انھوں نے خواب میں بلایا تھا اور مجھے تم خود اپنے ساتھ لائی ہو۔

زمرد: ہاں میں تم کو ساتھ لائی ہوں اور اسی سبب سے کہ اس دنیا میں مجھے تم سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ میری تمنا ہے کہ تمھارے پہلو میں تمھاری آنکھوں کے سامنے جان دوں۔ اس کے بعد تم گھر جاؤ اور وہاں عزیزوں اور شہر کے دیگر شرفا کے نزدیک میری جو بے عزتی ہُوئی ہے اس کو دور کرو اور میری خبر مرگ کے ساتھ

جا کے بتا دو کہ میں نے کیوں اور کہاں جان دی ہے اور مرتے وقت تک ایسی ہی پاک دامن تھی (گلے میں باہیں ڈال کر) حسین میری آرزو ہے کہ تم زندہ رہو اور میرے دامن سے بدنامی کا دھبا دھوؤ۔

حسین: (ایک نالہ جانکاہ کے ساتھ) خدا نہ کرے کہ میں تمھاری خبر مرگ لے جاؤں۔

ناگہاں ایک پہاڑی کی ڈھالو سطح پر کچھ روشنی نظر آئی جس پر پہلے زمرد کی نظر پڑی اور اس نے چونک کر کہا "یہ روشنی کیسی؟" حسین نے بھی اس روشنی کو حیرت سے دیکھا اور کہا "خدا جانے کیا بات ہے اور دیکھ ادھر ہی بڑھتی چلی آتی ہے۔ اس رات کی تاریکی میں یہاں آنے والے لوگ کون ہو سکتے ہیں؟"

دونوں روشنی کو گھبرا گھبرا کے اور ساعت بساعت زیادہ متحیر ہو کے دیکھ رہے تھے کہ وہ بالکل قریب آگئی۔ بڑی بڑی پندرہ بیس مشعلیں تھیں اور ان کے نیچے حسین و پری جمال عورتوں کا ایک بہت بڑا غول تھا جن کی صورت دیکھتے ہی زمرد اور حسین دونوں نے ایک چیخ ماری اور دہشت زدگی کی آواز میں دونوں کی زبان سے نکلا "پریاں!!" اور دونوں غش کھا کے بے ہوش ہو گئے۔

# مشق

۱۔ عبدالحلیم شرر نے کوہ البرز کی تیرہ و تار گھاٹی کا جو منظر پیش کیا اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ حسین اور زمرد سفر کے لیے اپنے اپنے گھروں سے کس طرح نکلے؟

۳۔ زمرد کے دل میں سفر کا اصل مقصد کیا تھا؟

۴۔ ناول کے اس اقتباس سے زمرد کی شخصیت کے کون سے پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں؟

۵۔ یہ اقتباس عبدالحلیم شرر کے مشہور ناول "فردوس بریں" سے لیا گیا ہے۔ یہ ناول حاصل کر کے پڑھیے۔

۶۔ ان الفاظ کے متضاد لکھیے: کم سن، شام، شریف، تاریکی، گریہ، غروب، بزدل، مغلوب۔

۷۔ ان الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ معنی واضح ہو جائیں: ساعت بساعت، ہیبت، فقرہ دینا، تحیر، وفور گریہ، فرح بخش، نغمہ سنج۔

# پاکستان بن گیا

خدیجہ مستوُر

پاکستان بن گیا، لیگی راہ نما کراچی دارالحکومت جاچکے تھے۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی۔ بڑے چچا اس صدمے سے جیسے نڈھال ہو گئے تھے۔ بیٹھک میں بیماروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے رہتے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟ یہ ہندو مسلمان ایک دم ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے ہو گئے؟ یہ انھیں کس نے سکھایا ہے؟ ان کے دل سے کس نے محبّت چھین لی؟"

جب وہ سب کچھ عالیہ سے پوچھتے تو وہ ان کا سر سہلانے لگتی۔ "بڑے چچا آپ آرام کیجیے، آپ تھک گئے ہیں بڑے چچا۔" اور بڑے چچا اس طرح آنکھیں بند کر لیتے جیسے خون کی ندی ان کی آنکھوں کے سامنے بہہ رہی ہو۔

"زمانے زمانے کی بات ہے، وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گاؤں کے مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندو کی عزّت بچانے کے لیے اپنی جان نچھاور کر دیتا، ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں، پر اب کیا رہ گیا، دونوں کے ہاتھوں میں خنجر آگیا تھا۔"
کریمن بوا فساد کی خبریں سن سن کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتیں۔ اپنے شہر میں فساد تو نہ ہوا تھا مگر سب کی جانوں پر بنی رہتی، پتہ نہیں کب کیا ہو جائے۔

"کہاں ہو گا میرا شکیل؟" بمبئی میں فساد کی خبر سن کر بڑی چچی بلکنے لگیں۔

"تمھارا پاکستان بن گیا جمیل، تمھارے ابّا کا ملک بھی آزاد ہو گیا، پر میرے شکیل کو اب کون لائے گا؟"

"سب ٹھیک ہو جائے گا اماں، وہ خیریت سے ہوگا۔ یہ فساد وساد تو چار دن میں ختم ہو جائیں گے۔"
جمیل بھیا ان کو سمجھاتے مگر ان کا چہرہ فق رہتا۔

شام سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ماموں کا خط آگیا۔ انھوں نے اماں کو لکھا تھا کہ انھوں نے اپنی خدمات پاکستان کے لیے وقف کر دی ہیں اور وہ جلد ہی جا رہے ہیں۔ "اگر آپ لوگوں کو چلنا ہو تو

فوراً جواب دیجیے اور تیار رہیے۔"

"بس ابھی تار دے دو جمیل میاں، ہماری تیاری میں کیا لگے گا، ہم تو بس تیار بیٹھے ہیں۔ ہے! اپنا بھائی ہے بھلا ہمیں اکیلا چھوڑ کر جاسکتا ہے؟" مارے خوشی کے اماں کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

جمیل بھیا نے اس طرح گھبرا کر سب کی طرف دیکھا جیسے فسادی ان کے دروازے پر پہنچ گئے ہوں "مگر آپ کیوں جائیں گی چھوٹی چچی؟ آپ یہاں محفوظ ہیں۔ میں آپ کے لیے اپنی جان دے دوں گا۔" انھوں نے آج بڑی مدت بعد عالیہ کی طرف دیکھا کیسی سفارشی نظریں تھیں مگر عالیہ نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

"میں نہ جاؤں تو ہندوؤں کے نگر میں رہوں، پاکستان میں اپنوں کی تو حکومت ہوگی، پھر میں اپنے بھائی کو چھوڑ کر ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتی، واہ۔" مارے خوشی کے اماں سے نچلا نہ بیٹھا جا رہا تھا۔

"عالیہ جانے پر راضی نہیں ہوگی چھوٹی چچی، وہ نہیں جائے گی، وہ جا ہی نہیں سکتی۔" جمیل بھیا نے جیسے نیم دیوانگی کے عالم میں کہا۔

"تم اچھے حق دار آگئے، کون نہیں جائے گا۔" اماں ایک دم بپھر اٹھیں۔ "تم ہوتے کون ہو روکنے والے؟"

"ضرور جائیے چھوٹی چچی۔" جمیل بھیا نے سر جھکا دیا اور عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ نہیں جاسکتی۔ صدیاں گزر جائیں گی مگر وہ یہاں سے ہل بھی نہ سکے گی۔

"میں ابھی تار کیے دیتا ہوں کہ سب تیار ہیں۔" جمیل بھیا اٹھ کر باہر چلے گئے۔

عالیہ کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ وہ نہیں جائے گی، وہ نہیں جاسکتی، اسے کوئی نہیں لے جاسکتا، مگر اس کے گلے میں تو سینکڑوں کانٹے چبھ رہے تھے، وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی، اس نے ہر طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں مگر وہ کیوں رکے، کس لیے کس کے لیے، اس نے سوچا اور پھر جیسے بڑے سکون سے چھالیہ کاٹنے لگی۔ عالیہ بیگم اگر تم رہ گئیں تو ہمیشہ کے لیے دلدل میں پھنس جاؤ گی۔

"کریمن بوا اگر سب لوگ چائے پی چکے ہوں تو ——" اسرار میاں نے بیٹھک سے آواز لگائی اور کریمن بوا آج تو ڈائنوں کی طرح چیخنے لگیں —— "ارے کوئی تو اس اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیج دو۔ سب چلے گئے، سب چلے جائیں گے مگر یہ کہیں نہیں جاتا۔"

بیٹھک میں اسرار میاں کی کھانسنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"کیا تم سچ مچ چلی جاؤ گی چھوٹی دلھن؟" بڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد بڑی چچی نے پوچھا۔

"ظاہر ہے کہ چلی جاؤں گی۔" اماں نے رکھائی سے جواب دیا۔

"یہ گھر تمھارا ہے چھوٹی دلھن، مجھے اکیلے نہ چھوڑو۔" بڑی چچی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بند کرلیں۔ شاید

تنہائی کے بھوت سے ڈر رہی تھیں۔

عالیہ جیسے پناہ ڈھونڈنے کے لیے اُوپر بھاگ گئی۔ دھوپ پیلی پڑ کر سامنے کے مکان کی اونچی دیوار پر چڑھ گئی تھی۔ ہائی سکول کے احاطے میں بسیرا لینے والے پرند مسلسل شور مچائے جا رہے تھے۔

کھلی فضا میں آ کر اس نے اطمینان کی سانس لی اور مسافروں کی طرح ٹہل ٹہل کر سوچنے لگی کہ اب آگے کیا ہوگا۔ شاید اچھا ہی ہو، وہ یہاں سے جا کر ضرور خوش رہے گی۔

جب وہ نیچے اتری تو سب اپنے خیالوں میں مگن بیٹھے تھے، صرف کریمن بوا جانے کس بات پر بڑ بڑا رہی تھیں اور پھرتی سے روٹیاں پکاتی جا رہی تھیں۔

جمیل بھیا کہاں گئے، اب تک کیوں نہیں آئے۔ عالیہ نے سونی کرسی کی طرف دیکھا۔ جانے یہ سرپھرا آدمی اسے یاد کرے گا یا بھول جائے گا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

لالٹین کی بتی خراب تھی اس لیے اس میں سے دو لویں اٹھ رہی تھیں اور ایک طرف سے چمنی سیاہ ہوگئی تھی۔ مدھم روشنی میں اماں، بڑی چچی اور کریمن بوا کے چہرے بگڑے بگڑے لگ رہے تھے۔

جمیل بھیا گھر میں داخل ہوئے اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ "میں تار کر آیا ہوں چھوٹی چچی۔" انھوں نے دھیرے سے کہا۔

تم اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرو، شام سے گھر آجایا کرو، جانے کب یہاں بھی گڑ بڑ ہو جائے۔" بڑی چچی نے کہا۔

"رہنا تو پڑتا ہے۔ مُسلمان ڈرے ہُوئے ہیں، انھیں سمجھانا ہے کہ وہ یہاں ڈٹ کر رہیں اور یہاں کی فضا کو پر امن رکھیں، گھر میں بیٹھ کر تو کام نہ چلے گا۔"

"توبہ اب ملک آزاد ہو گیا تو یہ کام شروع ہو گئے، خیر مجھے کیا، تم نے تار پر پتا ٹھیک لکھا تھا نا؟" اماں نے پوچھا۔

"آپ اطمینان رکھیں، پتا ٹھیک تھا۔"

"خیر سے ہم تو پاکستان جا رہے ہیں، مگر اب تم اپنے گھر کی فکر کرو جمیل میاں، کیا بری حالت ہو چکی ہے۔ اپنی اماں کی طرف بھی دیکھو۔" اماں نے ہمدردی سے بڑی چچی کی طرف دیکھا۔

"کون جا رہا ہے پاکستان؟" بڑے چچا نے صحن میں قدم رکھتے ہی بوکھلا کر پوچھا۔ انھوں نے اماں کی باتیں سن لی تھیں۔

"میں اور عالیہ جائیں گے، اور کسے جانا ہے۔" اماں نے تڑاق سے جواب دیا۔

"کوئی نہیں جاسکتا میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا، کس لیے جاؤ گے پاکستان ؟ یہ ہمارا ملک ہے، ہم نے قربانیاں دی ہیں اور اب ہم اسے چھوڑ کر چلے جائیں ؟ اب تو ہمارے عیش کرنے کا وقت آرہا ہے۔" بڑے چچا سخت جوش میں تھے۔

"ماشاء اللہ، آپ بڑے حقدار بن کر آگئے، نہ کھلانے کے نہ پلانے کے، کون سا دکھ تھا جو یہاں آکر نہیں جھیلا، میرے شوہر کو بھی آپ ہی نے چھین لیا۔ آپ ہی نے انھیں مار ڈالا۔ میری بیٹی کو یتیم کردیا اور اب حق جتا رہے ہیں۔" مارے غصّے کے اماں کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کریمن بوا میرا کھانا بیٹھک میں بھجوادو۔" بڑے چچا سر جھکا کر بیٹھک میں چلے گئے۔

"کیا آپ چلنے سے پہلے بڑے چچا کو یہی بدلہ دینا چاہتی ہیں ؟ بڑے چچا نے کسی کو تباہ نہیں کیا، بڑے چچا نے کسی کو دعوت نہیں دی تھی کہ آؤ اور میرا ساتھ دو۔ آپ آج اچھی طرح سن لیں کہ مجھے بڑے چچا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ابّا سے تھی۔" عالیہ نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر بیٹھک میں چلی گئی، اماں کیا کہتی رہ گئیں اس نے ذرا بھی نہ سنا۔

"کیا تم سچ مچ جارہی ہو بیٹی ؟"

"ہاں بڑے چچا اماں جو تیّار ہیں۔" اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

"یہ انگریز جاتے جاتے بھی چال چل گیا۔ لوگوں کو گھر سے بے گھر کرگیا، پھر بھی تم مت جاؤ بیٹی، اپنی ماں کو سمجھالو، اب تمھارے سکھ کا زمانہ آگیا ہے۔"

بڑے چچا میں اماں کا واحد سہارا ہوں، میں انھیں کس طرح چھوڑدوں، وہ ضرور جائیں گی مگر آپ کو نہیں معلوم کہ یہ گھر چھوڑ کر میں کس طرح تڑپوں گی، آپ ——— آپ تو ———" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

"چھوٹی دلھن کو مجھ سے سخت نفرت ہے، ٹھیک ہے میں نے تم لوگوں کے لیے کچھ بھی نہ کیا، مگر اب وقت آیا تھا کہ اس گھر میں پہلی سی شادمانی لوٹ آتی، مجھے بڑی اچھی ملازمت دی جارہی ہے۔ پھر دکانوں کو چلانے کے لیے دس پندرہ ہزار کی امداد بھی ملنے کی توقع ہے۔ میں چھوٹی دلھن کی سب شکائتیں رفع کردوں گا" ——— انھوں نے عالیہ کو پیار سے تھپکا ——— "کیا گھر میں تیل ختم ہوگیا ہے ؟ لالٹین کی روشنی مدھم ہوتی جارہی ہے، اب انشاء اللہ تھوڑے دنوں میں بجلی کا کنکشن بحال کرالوں گا۔ اور اب تم ایم اے میں داخلہ کیوں نہ لے لو۔ میرا خیال ہے کہ تم کو اگلے سال ضرور داخل کرادوں گا۔"

عالیہ کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ جی ہی جی میں گھٹ رہی تھی مگر ایک لفظ

بھی نہ بول سکی - خدا آپ کو سکھ دے بڑے چچا، خدا آپ کے سارے سہانے خواب پورے کرے —— وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی - وہ بڑے چچا سے کس طرح کہتی کہ وہ تو یہاں سے خود بھاگ جانا چاہتی ہے -

اسرار میاں بیٹھک میں داخل ہونے کے لیے پٹ کھول رہے تھے - عالیہ اٹھ کر صحن میں آگئی - اماں اور بڑی چچی جانے کیا باتیں کر رہی تھیں - جمیل بھیا اب تک کرسی پر بیٹھے انگلیاں مروڑ رہے تھے - وہ ایک لمحے تک آنگن میں کھڑی رہی اور پھر اوپر چلی گئی -

شبنم سے بھیگی ہوئی رات بڑی روشن ہو رہی تھی - چاند جیسے وسط آسمان پر چمک رہا تھا اور روز کی طرح آج بھی قریب کی کسی چھت پر گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے —— "تری گٹھڑی میں لاگا چور مسافر جاگ ذرا"

وہ آہستہ آہستہ ٹہلنے لگی - کیسی عجیب سی حالت ہو رہی تھی - جیسے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت کسی نے چھین لی ہو - "کیا یہ میں ہوں؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر اپنی آواز سن کر حیران رہ گئی —— حد ہے دیوانگی کی، وہ کس سے پوچھ رہی تھی -

ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک بار مڑی تو جمیل بھیا بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے - وہ اور تیزی سے ٹہلنے لگی - اب یہ کیا کہنے آئے ہیں - انھوں نے اپنا وعدہ بھلا دیا -

"کیا سچ مچ تم نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" انھوں نے دھیرے سے پوچھا -

"ہاں" اس نے ٹہلتے ہوئے جواب دیا -

"تم یہاں سے جا کر غلطی کرو گی - تم نے ایک بار کہا تھا نا کہ دور رہ کر یادیں بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں - میرا خیال ہے کہ تم وہاں خوش نہ رہو گی -"

"میں ہر جگہ خوش رہوں گی - مگر آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھ سے کبھی کچھ نہ کہیں گے -"

"میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"کچھ نہیں!"

"تم میری مقروض ہو، یاد رکھنا تم کو یہ قرض چکانا ہوگا -" وہ جانے کے لیے مڑے - "تم وہاں خوش رہو گی نا؟" انھوں نے رک کر پوچھا -

وہ چپ رہی - جمیل بھیا تھوڑی دیر کھڑے رہے اور پھر چلے گئے اور اس نے محسوس کیا کہ اس وقت وہ سب کچھ کھو بیٹھی ہے -

بڑی دیر تک یوں ہی ٹہلنے کے بعد جب وہ تھک گئی تو چھمی کو خط لکھنے بیٹھ گئی - اسے یہاں سے جانے کی اطلاع دینی تھی -

یہ رات پہاڑوں کا بوجھ اٹھائے ہُوئے ہے، کوئی اسے گزار دے۔ کوئی صبح ہونے کا پیغام سنا دے۔ اُسے صبح ہونے کا انتظار ہے۔ صبح وہ چلی جائے گی اور اس کرب سے نجات حاصل کرے گی۔

سب بول رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں، پھر بھی کیسا سناٹا چھایا ہُوا ہے۔ چاند کی کون سی تاریخ ہے۔ اب تک چاند نہیں نکلا۔ چھالیہ کاٹتے کاٹتے عالیہ نے سب کی طرف دیکھا۔ جمیل بھیا سب کی باتوں سے بے نیاز اپنی کرسی پر بیٹھے ایک سال گنگنائے جا رہے تھے۔

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں اُدھوری
مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی

جمیل بھیا آج سارا دن باہر نہیں نکلے تھے۔ آج ان کو فرصت ہی فرصت تھی۔ جیسے سارے کام ختم ہو گئے اور اب انھیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔

"بڑی بھابی، میں تو جا رہی ہوں مگر آپ میری ایک بات یاد رکھیے گا کہ اگر آپ نے بڑے بھیا اور جمیل میاں کو قابو میں نہ کیا تو آپ کی ساری عمر یوں ہی گزر جائے گی۔ اب تو آزادی بھی مل گئی، اب کون سا بہانہ رہ گیا ہے جو سارا دن دونوں باپ بیٹے آوارہ پھرتے ہیں۔" اماں بڑی چچی کو سمجھا رہی تھیں۔

"مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری ——— کہ ہے داستاں ادھوری ——— جمیل بھیا اسی ایک شعر کو رٹے جا رہے تھے۔

اس شعر کو بار بار پڑھ کر وہ کیا جتانا چاہتے تھے۔ وہ اس سے کیا کہہ رہے تھے؟ عالیہ کا سروتہ بڑی تیزی سے چھالیہ کاٹنے لگا۔ اللہ میاں اگر اس وقت اسے بہرہ کر دے تو پھر کتنا اچھا ہو۔

"چھوٹی دلھن، ایسا جان پڑتا ہے کہ کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے، بھرا پرا گھر تھا۔ دیکھتے دیکھتے سب تِتر بِتر ہو گئے، زمانے زمانے کی بات ہے۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا، قربان جاؤں اس مالک کے جس نے ایک ملک کے دو ملک بنا دیے، اپنے مُسلمانوں کی حکومت ہو گئی، پر ہم اکیلے رہ گئے۔" کریمن بوا جدائی کے صدمے سے نڈھال ہو رہی تھیں۔

"تم بھی چلو کریمن بوا۔" اماں نے بڑے خلوص سے کہا۔

"اب تو یہی دعا کریں چھوٹی دلھن کہ اس گھر سے لاش نکلے میری، آج یہاں سے چلی جاؤں تو مرنے کے بعد مالکن مرحومہ کو کیا منہ دکھاؤں گی، وہ اپنے جیتے جی جہاں بٹھا گئیں وہاں سے کیوں کر پاؤں نکالوں۔"

سیتا نے رام کی کھینچی ہوئی لکیر سے باہر قدم رکھا تھا تو راون اٹھا لے گیا تھا۔ سیتا نے جیتے جاگتے رام کی حکم عدولی کی تھی، مگر تم کریمن بوا مری ہوئی مالکن کا حکم نہیں ٹال سکتیں۔ پھر بھی سیتا سیتا رہیں اور تم

کریمن بوا رہوگی ۔ تم کو کون جانے دے گا تمہارا قصہ کون لکھے گا۔

عالیہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کریمن بوا کو دیکھا ۔ لالٹین کی مدھم زرد روشنی میں جدائیوں کے دکھ کتنے اجاگر ہو رہے تھے ۔

"چھوٹی دلھن اب بھی اپنا فیصلہ بدل دو ، مت جاؤ چھوٹی دلھن" بڑی چچی کی آواز بھاری ہو رہی تھی ۔

"مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری" ——— جمیل بھیا ساری باتوں سے بے نیاز ہو کر جیسے اس ایک شعر کی کیفیت میں ڈوب کر رہ گئے تھے ۔

اللہ کوئی تو اس رات کو گزار دے ورنہ آج وہ اپنی جان سے گزر جائے گی عالیہ نے سروتہ رکھ کر ادھر ادھر دیکھا ۔ چاند نکل رہا تھا ، آسمان روشن ہوتا جا رہا تھا ۔

"چھمی کا خط آیا تھا ، اس نے کیا لکھا ہے عالیہ ؟" بڑی چچی نے پوچھا ۔

"اس نے لکھا ہے کہ پاکستان جانا مبارک ہو ، ضرور جایئے ۔ اس پاک سرزمین کو میری طرف سے چومیے گا اور مجھے وہاں کی تھوڑی سی مٹی بھیج دیجیے گا ۔ میں اسے اپنی مانگ میں لگاؤں گی ، میں بدنصیب تو وہاں بھی نہیں جا سکتی ۔ اور سب کو دعا سلام لکھی ہے ۔" عالیہ کو جتنا یاد تھا سب سنا دیا ۔

"اور بھی کچھ لکھا ہے ؟" بڑی چچی نے پوچھا ۔

"بس یہی سلام دعا ، خط اوپر رکھا ہے ۔"

"مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی" ——— جمیل بھیا اب بھی سب سے بے نیاز تھے ۔

"جانے ہمارے مسلمانوں کا ملک کیسا ہوگا ، مکان بھی مل جائے گا جلدی سے کہ نہیں ، ہوٹل میں نہ ٹھہرنا چھوٹی دلھن ، صحت خراب ہو جائے گی وہاں کے کھانے سے ۔" کریمن بوا کو اب آگے کی فکر ستا رہی تھی ۔

"تم پریشان نہ ہو کریمن بوا ، میں جاتے ہی خط لکھ دُوں گی ۔" اماں نے کہا ۔

رات کے بارہ بج رہے تھے ۔ رات سرد ہوتی جا رہی تھی مگر سب لوگ بیٹھے تھے عالیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ بس اب کسی طرح اوپر بھاگ جائے ۔

"اچھا بھئی اب سونے کو چل دیے ، خدا حافظ" ——— جمیل بھیا کرسی سے اٹھ پڑے ——— مجھے اور زندگی دے ——— وہ کمرے میں چلے گئے ۔

بیٹھک کے دروازے کھلے اور بند ہو گئے ۔ بڑے چچا ایک ذرا دیر کو بھی اندر نہ آئے ۔ عالیہ انتظار کرتی رہ گئی ۔

گلی میں آوارہ کتے بھونک بھونک کر رو رہے تھے ۔ کاش نیند آجائے ، اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگ

رہی تھیں — ایک دن جب وہ یہاں آئی تھی اور پہلی رات اس کمرے میں گزاری تھی تو ساری رات سو نہ سکی تھی اور آج جب وہ یہاں سے جا رہی ہے تو پھر نیند نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کتنی بہت سی باتیں اس کا کلیجہ نوچ رہی تھیں — جمیل بھیا نے اس سے ایک بات بھی نہ کی۔ کیا جاتے جاتے وہ اب اس سے کچھ نہ کہیں گے۔ کیا اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہ گیا، اللہ، بڑے چچا کیا سوچ رہے ہوں گے، وہ بڑے چچا کو چھوڑ کر جا رہی ہے اور چھمی، خدا کرے اسے پاکستان آنا نصیب ہو جائے۔

جاگتے جاگتے صبح ہو گئی، نچلی منزل سے برتنوں کے کھڑکنے اور باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے کمرے پر ایک وداعی نظر ڈالی اور پھر نیچے آگئی۔

ناشتہ تیار تھا، وہ اماں اور بڑی چچی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کمرے کے کھلے دروازوں سے اس نے دیکھا کہ جمیل بھیا اب تک چادر تانے سو رہے تھے۔

حد ہو گئی بے مروتی کی۔ وہ جا رہی ہے اور ان کی آنکھ بھی نہیں کھلتی، جیسے موت کی نیند آگئی ہے۔ عالیہ کو کیسی ہٹیس لگ رہی تھی ان کے یوں ٹھاٹ سے سونے پر، وہ چلی جاتی تو پھر سو لیتے۔

ناشتے کے بعد اماں نے اپنے سارے سامان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کپڑوں اور ہلکے پھلکے دو کمبلوں کے سوا تمام سامان چھمی کے کمرے میں بھر دیا گیا تھا کہ جب اچھا وقت آئے گا تو پھر آ کر سب کچھ لے جائیں گے۔

"تانگے آگئے ہیں۔" اسرار میاں نے باہر سے آواز لگائی تو وہ جلدی سے بیٹھک کی طرف بھاگی۔ "کیا آج بڑے چچا بھی سوتے رہیں گے؟"

تمھارے بڑے چچا تو تڑکے ہی کہیں چلے گئے۔ کہتے تھے کہ کام ہے اور یہ بھی کہتے تھے کہ میں سب کو جاتے نہ دیکھ سکوں گا۔" کریمن بوا نے بڑی رقت سے بتایا۔

"یہ کہو نا کریمن بوا کہ وقت نہیں تھا جو رخصت کرنے بیٹھے رہتے" — اماں نے برا سا منہ بنایا۔

"بڑی بھابی، میرا سامان حفاظت سے رکھیے گا، اس کمرے میں تالا لگا دیجیے گا۔" اماں نے ایک بار پھر ہدایت دی۔

اللہ آج کی سیٹیں ریزرو نہ ہوتیں، آج وہ رک سکتی، بڑے چچا سے ملے بغیر وہ کس طرح جا سکتی ہے۔ وہ جیسے تھک کر بیٹھ گئی۔

"اٹھ جاؤ جمیل، تمھاری بہن اور چچی جا رہی ہیں۔ انھیں رخصت تو کرو۔" بڑی چچی نے تیسری بار جمیل بھیا کو آواز دی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"جلدی کرو کریمن بوا، ہوائی جہاز کسی کا انتظار نہیں کرتا، وقت پر اڑے گا۔" اسرار میاں نے پھر صدا لگائی۔

"خدا نہ کرے ۔میرا بھائی آج لاہور کے ہوائی اڈے پر انتظار کرے گا، جو ہم لوگوں کو نہ پایا تو کلیجہ پھٹ جائے گا اس کا" ——— اماں نے بوکھلا کر برقعہ اوڑھ لیا۔ "اب تم بھی جلدی کرو نا" ——— انھوں نے جھلا کر عالیہ کی طرف دیکھا جو اب تک بے سُدھ سی بیٹھی تھی۔

"بہت وقت ہو رہا ہے، پہلے سے پہنچنا اچھا ہوتا ہے" اسرار میاں کی آواز رکتی ہی نہ تھی۔

"ارے کوئی اس اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیج دو" کریمن بوا کلیجہ پھاڑ کر رو دیں۔

کریمن بوا اور بڑی چچی اماں سے مل مل کر رو رہی تھیں۔ مگر وہ دم بخود کھڑی رہی اسے تو رونا بھی نہ آرہا تھا۔

"اگر شکیل وہاں ملے تو خط ضرور لکھنا" بڑی چچی نے عالیہ کو لپٹا کر سرگوشی کی۔ "مجھے یاد رکھنا، جاؤ خدا کو سونپا" ——— ان کی آواز کانپ رہی تھی ——— "ارے اے جمیل اب تو اٹھ جاؤ بڑی چچی نے زور سے پکارا۔

"میں جا رہی ہوں، خود مل لوں گی" عالیہ نے کہا۔

"کیوں مل لوگی؟ وہ تو مارے نفرت کے ملنا نہیں چاہتا" اماں نے تیوریوں پر بل ڈال لیے۔

"بس اب چلو جلدی"

"میں جا رہی ہوں، خدا حافظ" عالیہ نے جمیل بھیا کے منہ پر سے چادر کھینچ لی اور پھر جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بھیگی اور سوجی ہوئی آنکھوں میں ایک داستان دم توڑ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ پھر بھی وہ آنکھیں تو اس کی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔

"تم جاتی کیوں نہیں بے وقوف لڑکی؛ کیا یہی دیکھنے کے لیے مجھے جگانے آئی تھیں؟ خدا حافظ" انھوں نے پھر منہ چھپا لیا۔

"جلدی چلو عالیہ" اماں کی آواز آئی۔ تب عالیہ کو خیال آیا کہ اسے جانا ہے، باہر تانگہ کھڑا ہے مگر اس کے پاؤں کیوں نہیں اٹھتے، اب وہ جاتی کیوں نہیں اور یہ کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں چھا رہا ہے۔

"کریمن بوا جلدی کرو بہت دیر ہو رہی ہے، اور چھوٹی دلھن سے اور عالیہ بی بی سے میری دعا کہہ دو اور کہہ دو کہ میرا کہا سنا معاف کریں اور کہہ دو کہ ——— " اسرار میاں کی آواز رک گئی۔

"خدا کرے کہ تمھاری زبان تھک جائے اسرار میاں" کریمن بوا نے تڑپ کر دعا مانگی۔

عالیہ سب کچھ سن رہی تھی مگر اس کے پاؤں! ارے اسے کوئی کھینچ کر لے جائے۔ وہ اس کمرے سے تو نکل جائے۔

"تم اس لیے دیر کرا رہی ہو کہ ہوائی جہاز ہم کو چھوڑ کر اڑ جائے۔ میرے بھائی کے ٹکٹوں کے دام غارت جائیں اور وہ ہمیں اس جہاز میں نہ پا کر پاگل ہو جائے" ——— اماں جانے اور کیا کہتیں کہ عالیہ وحشیوں کی

طرح بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"آپ کے بھائی اور بھاوج سے اتنا بھی نہ ہُوا کہ چار پانچ دن ہماری وجہ سے ٹھہر جاتے، ہمارے ساتھ سفر کر لیتے اور اب ہمارے لیے پاگل ہو جائیں گے ہاؤ ہو" عالیہ زور سے بولی اور پھر بڑی چچی سے لپٹ کر سسکنے لگی ——— (آنگن سے)

## مشق

۱۔ عالیہ اور جمیل بھیا کے کرداروں پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ "پنجاب میں خُون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی" سے کیا مراد ہے؟

۳۔ پاکستان بننے سے پہلے مسلمانوں کے دلوں میں کیا خدشات تھے؟

۴۔ خدیجہ مستور کا یہ ناول برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس موضوع پر کوئی اور ناول لکھا گیا ہو تو اس کا نام بتائیے۔

۵۔ "میں جا رہی ہوں خدا حافظ" عالیہ نے جمیل بھیا کے منہ پر سے چادر کھینچ لی اور پھر جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بھیگی اور سوجی ہوئی آنکھوں میں ایک داستان دم توڑ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بھی وہ آنکھیں تو اس کی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔

"تم جاتی کیوں نہیں بے وقوف لڑکی؟ کیا یہی دیکھنے کے لیے مجھے جگانے آئی تھیں؟ خدا حافظ" انھوں نے پھر منہ چھپا لیا۔ مندرجہ بالا سطور میں جن کیفیات کا اشارتاً ذکر ہوا ہے انھیں تفصیل سے بیان کیجیے۔

۶۔ اپنے جملوں میں اسی طرح استعمال کیجیے کہ معنی واضح ہو جائیں۔

رنگ فق ہونا، وقف کرنا، نچھاور کرنا، بپھر جانا، مگن ہونا، بوکھلا اٹھنا، بے گھر کرنا، حکم عدولی کرنا، ٹس سے مس نہ ہونا، تیوری چڑھانا۔

۷۔ مذکر کے مونث اور مونث کے مذکر لکھیے: ——— بھاوج، چچا، ابا، ماموں، خالہ، مرحوم، لڑکی۔

# مکاتیب غالب

## میر مہدی مجروح کے نام

میاں کس حال میں ہو؟ کس خیال میں ہو؟

کل شام کو میرن صاحب روانہ ہُوئے، یہاں اُن کی سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہُوئے، ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہادیے۔ خوش دامن صاحبہ بلائیں لیتی ہیں، سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں، بی بی مانند صورت دیوار چُپ، جی چاہتا ہے چیخنے کو مگر ناچار چپ۔ وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ کوئی جان نہ پہچان ورنہ ہمسائے میں قیامت برپا ہوتی، ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا گیا، گیارہ روپے خرچ راہ دیے۔ مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا یہی ہوگا کہ میرن صاحب تم سے بات چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے اور وہ محل غور ہے، ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودہ قلاقند ساتھ کر دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قلاقند تمھاری نذر کر کر تم پر احسان دھریں گے "بھائی میں دلی سے آیا ہوں، قلاقند تمھارے واسطے لایا ہوں۔" زنہار نہ باور کیجیو، مال مفت سمجھ کر لے لیجیو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کلو، ایاز کے سر پر قرآن رکھو، کلیان کے ہاتھ گنگا جلی دو، بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا، واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا۔ اور سنو، مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازے کے باہر صدر بازار تک ان کے پہنچانے کو گئے، رسم مشایعت عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی کون برا اور کون اچھا ہے؟ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ تو ان پر اپنی جان نثار کرتے ہیں، عورتیں صدقے جاتی ہیں، مرد پیار کرتے ہیں۔ میرٹھ سے آکر دیکھا کہ

میر صاحب!

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے لاہوری دروازہ کا تھانہ دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے، آٹھ دن قید رہتا ہے اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جماعہ دار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھ، میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ، عبارت یہ کہ اسد اللہ خان پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانہ میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنیل براؤن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے، اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے، پرسوں یہ عبارت جماعہ دار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی ہے، کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھا دو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے، گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے آج تک یہ صورت ہے، دیکھیے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے، جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں، یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔ الملک للہ والحکم للہ۔ نورچشم میر سرفراز حسین اور برخوردار میر نصیر الدین کو دعا۔ اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی اس میں سے وہ جو چاہیں قبول کریں۔

## قاضی عبدالجمیل جنوںؔ کے نام

قبلہ، آپ کو خط کے پہنچنے میں تردّد کیوں ہوتا ہے؟ ہر روز دو چار خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ گاہ گاہ انگریزی بھی، اور ڈاک کے ہرکارے بھی میرا گھر جانتے ہیں، پوسٹ ماسٹر میرا آشنا ہے۔ مجھ کو جو دوست خط بھیجتا ہے، وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے، محلہ بھی ضرور نہیں۔ آپ ہی انصاف کریں کہ آپ "لال کنواں" لکھتے رہے اور مجھ کو "بلی ماروں" میں خط پہنچتا رہا۔ یہ اب کے آپ نے "حکیم کالے" کا نام کیسا لکھا ہے؟ اس غریب کو تو شہر میں کوئی جانتا بھی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ خط آپ کا کوئی تلف نہیں ہوا۔ جو آپ نے بھیجا وہ مجھ کو پہنچا۔

بات یہ ہے کہ شوقیہ خطوط کا جواب کہاں تک لکھوں؟ میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر

مدار رکھا ہے ۔ جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں ؟ اب کی آپ کے خط میں تین مطلب جواب لکھنے کے قابل تھے ، ایک تو وہ رباعی جو آپ نے اس ننگ آفرینش کی مدح میں لکھی ہے ، اس کا جواب بندگی ہے اور کورنش اور آداب ۔

دوسرا مدعا خط کے نہ پہنچنے کا وسوسہ ، سو اس کا جواب لکھ چکا ۔

تیسرا امر جناب مولوی امتیاز خاں صاحب کا میرے ہاں آنا اور میرا اس وقت مکان پر موجود نہ ہونا ۔ واللہ مجھ کو بڑا رنج ہوا ۔ اگر آپ سے ملیں تو میرا سلام کہیے گا اور میرا ملال ان سے بیان کیجیے گا ۔ صبح کو میں ہر روز قلعے کو جاتا ہوں ۔ ظاہراً مولوی صاحب اول روز آئے ہوں گے ۔ جب میں سوار ہو جاتا ہوں ، تب بھی دو چار آدمی مکان پر ہوتے ہیں ۔ مولوی صاحب بیٹھتے ، حقہ پیتے ۔ میں اگر قلعے جاتا ہوں تو پہر دن چڑھے آتا ہوں ۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں ؟

(از اسد)

نگاشتہ سہ شنبہ ، نہم ربیع الاول ، ۱۲۷۲ھ ، مطابق ۲۰ نومبر

# مشق

۱ - غالب کے خطوط کی کیا خصوصیات ہیں ؟
۲ - میرن صاحب کی روانگی کا حال بیان کیجیے ۔
۳ - سید صاحب کے نام خط میں غالب نے دلی کی جو حالت بیان کی ہے اسے مختصر طور پر لکھیے ۔
۴ - غالب کے انداز میں اپنے دوست کو ایک مختصر خط لکھیے ۔

# مکتوب اکبر الٰہ آبادی

## عبدالماجد دریابادی کے نام

الٰہ آباد، ۴ جون ۱۷ء

عزیزی و حبیبی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ میں خوش ہوا کہ آپ برکلے کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ آپ کو خود انشاء اللہ بہت فائدہ پہنچے گا، بشرطیکہ آپ کو اس کی پروا ہو۔ میرا مطلب باطنی فائدے سے ہے۔ ہم تو اور ہم کیا قریباً وہ سب جن کو ہم نے جانا ہے، برکلے کی تقریر کو صحیح و دل نشیں پاتے ہیں۔ ہمارے تصوف کی کامل تائید ہے۔ کوشش کیجیے گا کہ بیان صاف ہو ابوالکلامی نہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ مباحث ہی پیچیدہ ہوں تو کوئی کیا کرے۔ ہندوستان کا پالیٹکس بہت پیچیدہ اور مشکل اور خطرناک ہوتا جاتا ہے۔ اُردو یونیورسٹی بھی اسی میں داخل ہے۔

ہندو کا ہوم رُول اور ذوقِ ہندی بھی اسی میں داخل ہے۔ انڈین کا فوج میں داخل ہونا بھی اس میں داخل ہے۔ بہرحال زندگی بسر کرنا ہے۔ مجھ کو ایک مضمون لکھنا ہے۔ بہ ضرورت خاص میں تو نیبولا (NEBULA) ہی لکھوں گا لیکن ضیابتہ النجوم، بھی بریکٹ میں لکھ دوں گا۔ خدا وہ وقت لائے کہ آپ کی تصنیفات الماریوں سے سینوں میں اور سینوں سے زبانوں پر پہنچیں۔ بھائی صاحب کو تسلیم، کہاں ہیں؟ جون نے جان چھوڑ دی تو جولائی میں شاید ملنا ہو۔

اکبر حسین

## مشق

۱۔ اکبر نے کیسے انداز تحریر کو پسند کیا ہے؟

۲۔ ابوالکلامی سے کیا مراد ہے؟

۳۔ اس خط سے ہندوؤں کی سیاست پر کیا روشنی پڑتی ہے؟

# مکاتیب اقبال

## مولانا گرامی کے نام

لاہور، ۱۲ جولائی ۱۴ء

جناب مولانا گرامی آپ کہاں ہیں؟ حیدرآباد میں عدم آباد میں! اگر عدم آباد میں ہیں تو مجھے مطلع کیجیے کہ میں آپ کو تعزیت نامہ لکھوں۔ صدیاں گزر گئیں کہیں آپ کا کلام دیکھنے میں نہیں آیا۔ کبھی کبھی چند اشعار بھیج دیا کرو تو کون سی بڑی بات ہے۔ میں تو اب بوجہ مشاغلِ منصبہ، کے تارک الشعر ہوں۔ ہاں کبھی فرصت ملتی ہے تو فارسی اساتذہ کے اشعار پڑھ کر مزا اٹھا لیتا ہوں۔ میری شاعری گھٹ کر اب اس قدر رہ گئی ہے کہ اوروں کے اشعار پڑھ لوں۔ گزشتہ سال ایک مثنوی فارسی لکھنی شروع کی تھی۔ ہنوز ختم ہوئی نہیں اور اس کے اختتام کی امید بھی نہیں۔ خیالات کے اعتبار سے مشرقی اور مغربی لٹریچر سے یہ مثنوی بالکل نئی ہے لیکن آپ سے ملاقات ہو تو آپ کو اس کے اشعار سناؤں۔ مجھے یقین ہے آپ اسے سن کر خوش ہوں گے۔ کہیے ادھر آنے کا کب تک قصد ہے؟ میں ایک عرصے سے آپ کا منتظر ہوں۔ خدارا جلد آئیے۔ سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ آکر میری مثنوی سنیے اور اس میں مشورہ دیجیے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

امید ہے کہ بابا گرامی اچھا ہوگا اور نئے نکاح کی فکر میں اپنے آپ کو نہ گھلاتا ہوگا۔ گھر میں میری طرف سے سلام کہہ دیجیے۔

خط کا جواب جلد لکھیے اور نیز یہ کہ اپنے اشعار بھی بھیجیے۔ میری مراد تازہ افکار سے ہے۔

آپ کا خادم محمد اقبال

# اکبر الٰہ آبادی کے نام

۱۶، جولائی ۱۴ء

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا السلامُ علیکم!

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا جس کو پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ حضرت! میں آپ کو اپنا پیر و مرشد تصور کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی اس وقت بھی میری ارادت و عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے اور انشاء اللہ جب تک زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی۔ اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا۔ کیوں کہ شاعری سے میرا مقصد بقول آپ کے حصولِ دولت و جاہ نہیں محض اظہارِ عقیدت ہے۔

عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کو داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو، اس کے رنگ میں شعر لکھے یا بار دیگر اس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ میں نے بھی اس خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے ہیں مگر عوام کے رجحان اور بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے۔ سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھ عطا کرے۔ نقاد کو جو خط آپ نے لکھا ہے میں اسے شوق سے پڑھوں گا۔ اگر وہ شائع ہو جائے تو رسالے کی کاپی بھیج دیجیے گا۔ میرے پاس نقاد نہیں آتا۔

سبحان اللہ "غم بڑا مدرک حقائق ہے" زندگی کا سارا فلسفہ اس ذرا سے مصرعے میں مخفی ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ لاہور میں اب کے بارش بالکل نہیں ہوئی، ابر روز آتا ہے مگر لاہور کی چار دیواری کے اندر اسے برسنے کا حکم نہیں ہے۔ اگست کے ابتدا میں چند روز کے لیے شملہ جانے کا قصد ہے۔ کچہری ۳، اگست سے بند ہو جائے گی۔

والسلام

آپ کا خادم محمد اقبال

# شیخ نور محمدؒ کے نام

لاہور ۳ جون ۲۰ء

قبلہ و کعبہ السّلام علیکم !

آپ کا والانامہ ملا - الحمد للہ کہ آپ کی صحت اچھی ہے اور مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ دیر تک آپ کا سایہ ہمارے سر پر رکھے گا- بھائی صاحب نے اس سے پہلے کسی خط میں آپ کے انتظام خوراک وغیرہ کے بارے لکھا تھا- یہ طریق اچھا ہے اور اسی کو دستور العمل بنانا چاہیے - میں نے یورپ کے مشہور حکیم کی کتاب میں دیکھا ہے کہ جو شخص ہر روز دہی کی لسی پیا کرے اس کی عمر بڑھتی ہے - وہ کہتا ہے انسان کے جسم میں ایسے جراثیم ہیں جو قاطع حیات ہیں اور دہی کی لسی ان جراثیم کے لیے بمنزلہ زہر کے ہے - یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے رہنے والے لوگ شہریوں کی نسبتاً عموماً طویل العمر اور تندرست ہیں۔ علی بخش نے کل مجھے بتایا کہ اس کی چچی کی لمبی عمر ہوئی اور آخر عمر میں اس کا گذران زیادہ تر لسی پر تھا- ترش لسی تو شاید آپ کے لیے مفید نہ ہو کہ آپ کا گلا خراب ہے البتہ میٹھے دہی کی لسی اگر صبح پی جائے تو شاید مفید ہو - اس کا تجربہ بھی کرنا چاہیے - افسوس ہے کہ کوئی اچھا مکان رہنے کو نہیں ملتا- موجودہ مکان میں جوان لوگ تو بہ آسائش رہ سکتے ہیں ، بوڑھوں کو تکلیف ہے ورنہ بڑی خواہش تھی کہ سال کا زیادہ حصہ آپ کے پاس بسر کیا کرتے - ذرا ریل کا انتظام ٹھیک ہو جائے تو انشاء اللہ آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں گا- ڈاکٹر عبد اللطیف نے آپ کے دانت بنائے تھے اگر وہ خراب ہو گئے ہوں تو ان کو ڈاک میں بھیج دیجیے گا ، پھر مرمت کروائے جائیں گے - اگر وہ قابلِ مرمت بھی نہ ہوں تو لکھیے ڈاکٹر عبد اللطیف کو سیالکوٹ بھیج دوں گا کہ وہاں جا کر آپ کے دانت بنادے - باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے -گھر سے سب آپ کی خدمت میں آداب لکھواتی ہیں-

روحانی کیفیات کا سب سے بڑا ممد و معاون یہی کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط ہے - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے - میں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے پینے کے متعلق اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں - دنیا کے حالات اور عام لوگوں کے حالات ایسے ہی ہیں ان کی طرف توجہ کرنا چاہیے - عام لوگوں کی نگاہ بہت تنگ ہے - ان میں سے بیشتر حیوانوں کی زندگی بسر کرتے ہیں - اسی واسطے مولانا روم ایک جگہ

لکھتے ہیں کہ چراغ لے کے تمام شہر میں پھرا کہ کوئی انسان نظر آئے مگر نظر نہ آیا۔ اور موجودہ زمانہ تو روحانیت کے اعتبار سے بالکل تہی دست ہے، اسی واسطے اخلاص، محبت و مروت و یک جہتی کا نام و نشان نہیں رہا۔ آدمی آدمی کا خون پینے والا اور قوم قوم کی دشمن ہے۔ یہ دور انتہائی تاریکی کا ہے۔ لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوعِ انسان کو پھر ایک دفعہ نورِ محمدی عطا کرے۔ بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس دنیا کی نجات نظر نہیں آتی۔ زیادہ کیا عرض کروں خدا کا فضل ہے۔ غلام رسول بیمار تھا۔ کل میں نے اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فیروز پور تار دیا تھا مگر تاحال جواب نہیں آیا۔ آج کل تار بھی دیر میں پہنچتے ہیں۔

والسلام ——— محمد اقبال

(کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ سید مظفر حسین برنی جلد دوم)

اردو اکیڈمی دہلی ۱۹۹۱ء

## مشق

۱ - اقبال نے کھانے پینے کے معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا سنت بیان کی ہے؟

۲ - اقبال نے یورپ کے کسی حکیم کی کتاب میں طویل عمری کا کیا راز پڑھا؟

۳ - روحانیت کی کمی سے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

۴ - تشریح کیجیے:-

(الف) غم بڑا مدرک حقائق ہے۔

(ب) اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا کیوں کہ شاعری سے میرا مقصد بقول آپ کے حصولِ دولت و جاہ نہیں محض اظہار عقیدت ہے۔

(ج) کسی شاعر کو داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو اس کے رنگ میں شعر لکھے یا بارِ دیگر اس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ میں نے بھی اس خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے ہیں مگر عوام کے رجحان اور بد اخلاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے۔

# حمد

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعبِ جمال تیرا
چھُوٹے ہوئے ہیں گو جی پر دل بندھے ہوئے ہیں
ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا
گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا
ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا
دل ہو کہ جان تجھ سے کیوں کر عزیز رکھیے
دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا
ہے پاس دوستوں کے تیری یہی نشانی
یارب! کبھی نہ پائے زخم اندمال تیرا
بیگانگی میں حالی یہ رنگِ آشنائی
سن سن کے، سر دھنیں گے قال اہلِ حال تیرا

الطاف حسین حالی

# چراغِ کعبہ

مولانا ظفر علی خاں

عرب کا اور عجم کا ذرّہ ذرّہ جگمگا اٹھا
جہاں میں روشنی پھیلی چراغِ کعبہ کی گھر گھر

جب اس کی تیل بتی کا نبیؐ خود کر گئے ساماں
بُجھا سکتی ہے پھر کب اس دیئے کو کفر کی صرصر

یہاں الہام کی باتیں وہاں اوہام کی گھاتیں
ادھر اسلام کی تکبیر ادھر اصنام کی ہر ہر

رسولؐ اللہ کی اُمت کی زنگارنگیاں دیکھو
کہیں چینی کہیں ترکی کہیں ہندی کہیں بربر

سلام اس پر کیا اس طرح از بر جس نے قرآں کو
کہ جو کچھ سُن لیا جبریلؑ سے دوہرا دیا فرفر

ترے دروازے کی چوکھٹ ہے یارب اور سر میرا
یہ سر جب ہو چکا تیرا تو پھر میں کیوں پھرُوں در در

مرا خس پوش کاشانہ کہیں اچھا ہے راحت میں
اس ایوان مشید سے جو ہے پروردۂ مرمر

## مشق

۱ - چراغِ کعبہ سے شاعر کی کیا مراد ہے ؟

۲ - "یہاں الہام کی باتیں ، وہاں اوہام کی گھاتیں - ادھر اسلام کی تکبیر ادھر اصنام کی ہر ہر" تشریح کیجیے -

۳ - معنی لکھیے - صرصر ، فرفر ، کاشانہ ، ایوان ، پروردہ -

# برسات کا لطف

نظیر اکبر آبادی

ساقیا موسمِ برسات ہے کیا رُوح افزا  
دیکھ کچھ تازگی صنعتِ بے چُون و چرا

جا بجا نکلے ہیں اس لطف سے طفلانِ نبات  
اپنے ہاتھوں سے کھلائی ہے جنھیں نشو و نما

کھل رہے ہیں در و دیوار پہ ابوابِ بہشت  
آرہی ہے چمنِ خلد کی ہر گھر میں ہَوا

کوہ و صحرا میں وہ سبزی ہے کہوں کیا گویا  
مخملِ تازہ کسی نے ابھی یاں دی ہے بچھا

الغرض دشت تو ہیں کارگہِ مخملِ سبز  
اور جو ہیں کوہ تو ان پر بھی زمرد ہے فدا

جان سے کرتی ہے اب نزہت و خضرت وہ سلوک  
جیسے غنچوں سے نسیمِ سحر اور گل سے صبا

ہے زمینِ چمن و باغ جو پانی سے سفید  
اس میں اب عکس ہر اک گل کا ہے یُوں جلوہ نما

عقل کہتی ہے تامل سے جسے دیکھ کہ یہ  
طشتِ بلور ہے اقسامِ جواہر سے بھرا

شاخ پر گل سے یہ عالم ہے کہ جیسے محبُوب  
سُرخ دستار پہ سر رکھتا ہے اور سبز قبا

غلغلِ رعد خوش آتا ہے ہر ایک گوش کو یُوں  
جیسے شادی میں پسند آتی ہے نوبت کی صدا

برق بھی چمکے ہے اور دمکے ہے ایسی ہر دم  
جس سے کیا کیا امنڈ اور جھوم کے آئے ہے گھٹا

بدلیاں بدلے ہیں وہ رنگ نئے ہر ساعت  
جن کے ہر رنگ پہ ہو مانی کے اژرنگ فدا

اس طرح برسے ہے جھڑیوں کو لگا کر باراں  
منسلک جیسے ہو سلکِ گہرِ بیش بہا

اب میں ساون کی اندھیری کی کہوں کیا تعریف  
جعدِ شیریں کہوں یا زلفِ سیاہِ لیلےٰ

جگنو اس طرح چمکتے ہیں کہ جُوں وقتِ سنگار  
ماتھے پر ہاتھی کے شنگرف ہے گویا چھڑکا

کہیں رقاص کا رقص اور کہیں مطرب کا سرود  
کہیں ساقی مے و ساغر طرب و برگ و نوا

زہرہ واں ہو کے خوش گاتی ہے وہ میگھ ملھار  
جس کو سُن سُن کے فلک ناچے ہے بر روئے ہوا

مور کا شور و فغاں غوک کی جھینگر کی جھنکار  
پی پی ہر آن پپیہے کی ہے کوئل کی صدا

اہلِ ظاہر تو ہیں سب مست مۓ عیش و سرور  
اہلِ باطن بھی اچھلتے ہیں پڑے وجد میں، آ

## مشق

۱ : اس نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
۲ : "کھل رہے ہیں در و دیوار پہ ابوابِ بہشت - آرہی ہے چمنِ خلد کی ہر گھر میں ہوا"۔ تشریح کیجیے۔
۳ : اہلِ ظاہر اور اہلِ باطن سے کیا مراد ہے؟

# قطعات

اکبر الٰہ آبادی ________

(۱)

بنائے ملت بگڑ رہی ہے ، لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر- ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا ابھر رہے ہیں
ادھر ہے قومِ ضعیف و مسکیں اُدھر ہیں کچھ مرشدانِ خود بیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہی ہے وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں
کٹی رگِ اتحادِ ملّت رواں ہوئیں خون دل کی موجیں
ہم اس کو سمجھے ہیں آبِ صافی نہا رہے ہیں نکھر رہے ہیں
صدائے الحاد اٹھ رہی- ہے خدا کی اَب یاد اٹھ رہی ہے
دلوں سے فریاد اٹھ رہی ہے کہ دین سے ہم گزر رہے ہیں
جناب اکبر سے کوئی کہہ دے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے
اس انجمن میں اور ایسی باتیں یہ آپ کیا قہر کر رہے ہیں

(۲)

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھُولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھُولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھُولو

## مشق

۱- ان قطعات میں اکبر نے ہمیں کیا پیغام دیا ہے ؟
۲- ضعیف و مسکین کو مرکبِ عطفی کہتے ہیں ، اس طرح کے پانچ مرکبات لکھیے۔
۳- پہلے قطعہ کے آخری شعر میں ، شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے ۔ غزل یا قطعے کا وہ شعر جس میں تخلص آئے مقطع کہلاتا ہے ، آپ کو کوئی اور مقطع یاد ہو تو لکھیں۔

# رباعیات

——— اکبر الہ آبادی

○

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

○

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سُنا ہے اہلِ غیرت سے یہی
جینا ذلّت سے ہو تو مرنا اچھا

○

دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے
لذّت وہ ہے کہ جوشِ صحت سے ملے
ایماں کا ہو نورُ دل میں وہ راحت ہے
عزّت وہ ہے جو اپنی ملت سے ملے

○

تعلیم بھی پائی سب کے پیارے بھی ہُوئے
دنیا کو بھی خوش کیا ہمارے بھی ہُوئے
لیکن جو یہ نورِ طبع پایا نہ گیا
پھر کیا تم عرش کے جو تارے بھی ہُوئے

○

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزّت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بے کار
مذہب جو نہیں تو آدمیّت بھی نہیں

○

مسکین گدا ہو یا ہو شاہ ذی جاہ
بیماری و موت سے کہاں کس کو پناہ
آ ہی جاتا ہے زندگی میں اک وقت
کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ اللہ

# مشق

۱- پہلی رباعی میں شاعر نے کہا کہ آنکھیں تو بہت تھیں مگران میں بینا کم تھیں، اس کا کیا مطلب ہے ؟

۲- (ل) گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں -

(ب) عزت وہ ہے جو اپنی ملت سے ملے ، وضاحت کیجیے -

۳- صحیح یا غلط پر نشان لگایئے :

(ل) رباعی میں چار مصرعے ہوتے ہیں ، صحیح / غلط

(ب) رباعی میں مقطع ضرور ہوتا ہے ، صحیح / غلط

# ولادتِ پاک

——— خواجہ الطاف حسین حالی

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت  بڑھا جانب بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحانے کی وہ ودیعت  چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ہُوئی پہلوئے آمنہ رض سے ہویدا
دُعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحاؑ

ہُوئے محو عالم سے آثارِ ظلمت  کہ طالع ہُوا ماہِ برجِ سعادت
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مُدت  کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالتؐ
یہ چالیسویں سال لطفِ خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا  مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا  وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا غریبوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولا

خطا کار سے درگزر کرنے والا  بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا  قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کُندن بنایا  کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا  پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

پڑی کان میں دھات تھی اک نکمی     نہ کچھ قدر تھی اور نہ قیمت تھی جس کی
طبیعت میں جو اس کے جوہر تھے اصلی     ہُوئے سب تھے مٹی میں مل کر وہ مٹی
یہ تھا ثبت لیکن قضا و قدر میں
کہ ہو جائے گی وہ طلا اک نظر میں

## مشق

۱- اس نظم کی روشنی میں حضورؐ کی ولادت پر نثر میں دو پیرا گراف لکھیے۔
۲- مسِ خام کو جس نے کندن بنایا۔ کے کیا معنی ہیں ؟
۳- اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:
قضا و قدر، آثارِ ظلمت ، غم کھانا ، شیر و شکر ہونا ، نسخۂ کیمیا۔
۴- تیسرے ، پانچویں اور چھٹے بند کی تشریح کیجیے۔

# حُبِّ وطن

مولانا حالؔی

آؤ تمھیں بتاؤں کہ حُبِّ وطن ہے کیا
وہ کیا چمن ہے اور ہوائے چمن ہے کیا

وہ رحمتِ خدا کہ جو بندوں پہ عام ہے
وہ لطفِ عام جس سے جہاں شاد کام ہے

حُبِّ وطن ہے جلوہ اسی نورِ پاک کا
اور روشن اس کے نور سے عالم ہے خاک کا

وہ نورِ مہر جس سے زمانے میں نور ہے
وہ نور ذرّے ذرّے میں جس کا ظہور ہے

ہو مہر میں یہ نور تو اس کی کرن کہیں
گر دل میں جلوہ گر ہو تو حُبِّ وطن کہیں

رکھتا جو سب پہ لطف و کرم کی نگاہ ہو
اور دل سے ہر بشر کے لیے خیر خواہ ہو

آوارۂ سفر ہو کہ موجود گھر میں ہو
ہاتھ اپنا جیبِ نفع میں ہو یا ضرر میں ہو

ہر حال میں رہیں اسے اہلِ وطن عزیز
اور ہوویں نیک و بد روشِ جان و تن عزیز

حُبِّ وطن کے ملک میں فرماں روا ہے وہ
تاج و سریر ہو کہ نہ ہو بادشہ ہے وہ

## مشق

۱- حُبِّ وطن پر ایک مختصر سا مضمون لکھیے۔

۲- شاعر نے وطن سے محبت کرنے والے شخص کو بادشاہ کہا ہے۔ آپ کے خیال میں یہ بات کہاں تک درست ہے؟

۳- نفع اور ضرر ایک دُوسرے کے متضاد ہیں۔ اس نظم میں اور کون کون سے متضاد الفاظ استعمال ہُوئے ہیں۔

# لطفِ سحر

احسان دانش

صبح کا پیارا سماں ہے کس قدر کیف آفریں
جنت الفردوس سے بڑھ کر ہے پہنائے زمیں

اٹھ رہی ہے خود بخود انوارِ مشرق سے نقاب
چاند کے جلوؤں کی پھیکی پڑ گئی ہے آب و تاب

تیرگی میں سیم گوں جلوے نمایاں ہو چلے
تان کر تنویر کی چادر ستارے سو چلے

ہر گلِ نورستہ خوشبو کا امانت دار ہے
ہر کلی اب مسکرانے کے لیے تیار ہے

وہ اندھیرا، رات جو میداں میں تھا چھایا ہوا
ہے درختوں کی گھنی شاخوں میں تھرایا ہوا

نور ظلمت کے تعاقب میں ہے سرگرمِ خرام
لے رہی ہے روشنی تاریکیوں سے انتقام

حُسنِ فطرت کے نظارے دل کو تڑپانے لگے
صبح کے دامن میں چشمے بھیرویں گانے لگے

ہلکی ہلکی سانس سی لینے لگیں پھلواریاں
ہوگئیں گلشن میں ہر سُو کیف کی موجیں رواں

ہر شعاعِ مہر آکر ہو رہی ہے سر بہ خم
بن رہا ہے گلستاں کا گلستاں بابِ حرم

## مشق

۱- اس نظم میں شاعر نے صبح کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں سب سے زیادہ اہمیت قدرتی مناظر کو دی گئی ہے۔ اگر شہر میں صبح کا منظر اجاگر کیا جاتا تو کن چیزوں کا تذکرہ ضروری ہوتا؟

۲- تشریح کیجیے، ——— ہر شعاعِ مہر آکر ہو رہی ہے سر بہ خم  بن رہا ہے گلستاں کا گلستاں بابِ حرم

# ذوقِ جہاد، عظمتِ انساں ہے آج کل

احسان دانش

کچھ اور ہی فضائے گلستاں ہے آج کل
ہر پھول، زخمِ سینہ دوراں ہے آج کل
سلجھا رہا ہے وقت، مقدر کی گتھیاں
مشکل جو آپڑی تھی وہ آساں ہے آج کل
وہ سرزمیں کہ جس پہ تھا بارود کا دھواں
خونِ عدو سے لالہ بداماں ہے آج کل
ان کی طرف مشین گنیں ہیں ہوا کریں
اپنی طرف تو رحمتِ یزداں ہے آج کل
حائل نہیں سفر میں کوئی تیرگی کہیں
ہر راہ پر لہو سے چراغاں ہے آج کل
شق ہو رہے ہیں شب کے دھماکوں سے بام و در
ہر راستے پہ موت خراماں ہے آج کل
اب زندگی کے ہجر میں بے تاب ہے سکوں
اور زندگی سکوں سے گریزاں ہے آج کل
مومن ازل سے جس کا طلب گارِ خاص ہے
وہ موت اس دیار میں ارزاں ہے آج کل
فتویٰ یہ دے رہے ہیں فقیہانِ کارزار
ذوقِ جہاد عظمتِ انساں ہے آج کل
دانش ذرا یہ موسمِ فتح و ظفر تو دیکھ
جو ہے مقابلے پہ گریزاں ہے آج کل

# مشق

۱ - اس نظم کے ذریعے شاعر کیا کہنا چاہتا ہے ؟

۲ - مومن ازل سے جس کا طلب گارِ خاص ہے وہ موت اس دیار میں ارزاں ہے آج کل سے کیا مراد ہے ؟

۳ - اس نظم میں زخم ، بارود ، خون ، مشین گنیں ، لہو ، دھماکے اور موت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں - ان میں ایک خاص ربط پایا جاتا ہے - آپ کچھ اور الفاظ لکھیں جن کا اسی طرح آپس میں تعلق ہو -

# غزوۂ بدر کی فضیلت

حفیظ جالندھری

جہادِ بدر کی تاریخ کو دہرا رہا ہوں میں
گزشتہ سال کا زریں ورق الٹا رہا ہوں میں

جہادِ بدر کا دن عزت و اکرام کا دن تھا
اطاعت کا ثمر تھا، ضبط کے انعام کا دن تھا

شواہد میرے دعوے کے ہیں ارشاداتِ قرآنی
کہ فتحِ بدر اک آیت تھی من آیاتِ ربانی

بِنا ہے سورۂ انفال میری اس گزارش کی
فرشتے حق نے بھیجے اور احسانوں کی بارش کی

بظاہر بے حقیقت تھی جماعت حق پژوہوں کی
مگر کایا پلٹ دی اس نے باطل کے گروہوں کی

نہتے تین سو تیرہ بشر ذوقِ شہادت میں
خدا کے نام پر نکلے محمدؐ کی قیادت میں

نہ کثرت تھی نہ شوکت تھی نہ کچھ سامان رکھتے تھے
فقط اخلاص رکھتے تھے فقط ایمان رکھتے تھے

نہ تاج و تخت کے طالب نہ مال و جاہ کے سائل
کہ یہ بندے تھے لا معبود الا اللہ کے قائل

پسندیدہ نظر آیا تھا وحدت کا اصول ان کو
بہم باندھے ہوئے تھا رشتۂ حبِ رسولؐ ان کو

یہ ہادی کی ہدایت پہ چلے میدان میں آئے
یہ گردابِ ہلاکت میں گھرے طوفان میں آئے

لیا راہِ وفا میں عشق نے جب امتحاں ان کا
تو استقلال پایا صورتِ کوہِ گراں ان کا

اقلیت رہی قائم صراطِ حسنِ نیت پر
تو حق نے اس کو غالب کر دکھایا اکثریت پر

بسا اوقات نصرت دے کے وحدت کیش ملت کو
خدا کثرت پہ غالب کر دیا کرتا ہے قلت کو

غرور و ناز مٹ جاتا ہے جاہ و مال والوں کا
خدا ساتھی ہوا کرتا ہے استقلال والوں کا

## مشق

۱ - غزوہ کسے کہتے ہیں؟ غزوۂ بدر کے واقعات مختصر طور پر بیان کیجیے۔

۲ - لیا راہِ وفا میں عشق نے جب امتحان ان کا — تو استقلال پایا صورتِ کوہِ گراں ان کا، تشریح کیجیے۔

۳ - الفاظ و تراکیب کی تشریح کر کے انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔
زریں ورق، عزت و اکرام، شواہد، نہتے، ذوقِ شہادت۔

# توسیعِ شہر

مجید امجد

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر، بانکے پہرہ دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے، ہرے بھرے اشجار
جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم
گری دھڑام سے گھایل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک، اے آدم کی آل

## مشق

۱- شاعر اس نظم کے ذریعے کیا کہنا چاہتا ہے؟

۲- شاعر کو درختوں کے کٹنے سے جو دکھ ہوا اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۳- بانکے پہرہ دار، گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بور لدے، چھتنار- یہ سب اوصاف درختوں کے لیے بیان ہوئے ہیں- آپ کسی اور چیز کا نام لے کر اس کے چار پانچ اوصاف گنوائیں۔

# پرانی موٹر

ـــــــــ ضمیر جعفری

یہ چلتی ہے تو دو طرفہ ندامت ساتھ چلتی ہے
بھرے بازار کی پوری ملامت ساتھ چلتی ہے
بہن کی التجا، ماں کی محبت، ساتھ چلتی ہے
وفائے دوستاں بہرِ مشقت ساتھ چلتی ہے

بہت کم اس "خرابے" کو خراب انجن چلاتا ہے
عموماً زورِ دستِ دوستاں ہی کام آتا ہے

کبھی بیلوں کے پیچھے جوت کر چلوائی جاتی ہے
کبھی خالی خدا کے نام پر کھچوائی جاتی ہے
پکڑ کے بھیجی جاتی ہے، جکڑ کے لائی جاتی ہے
وہ کہتے ہیں کہ اس میں پھر بھی موٹر پائی جاتی ہے

اذیت کو بھی اک نعمت سمجھ کر شادماں ہونا
تعال اللہ یوں انساں کا مغلوبِ گماں ہونا

بہ طرزِ عاشقانہ دوڑ کر، بے ہوش ہو جانا
بہ رنگِ دلبرانہ جھانک کر روپوش ہو جانا
بزرگوں کی طرح کچھ کھانس کر، خاموش ہو جانا
مسلمانوں کی صورت دفعتاً پرجوش ہو جانا

قدم رکھنے سے پہلے لغزشِ مستانہ رکھتی ہے
کہ ہر فرلانگ پر اپنا مسافر خانہ رکھتی ہے

دمِ رفتار دنیا کا عجب نقشا دکھائی دے
سڑک بیٹھی ہوئی اور آدمی اڑتا دکھائی دے

نظامِ زندگی یکسر تہہ و بالا دکھائی دے
یہ عالم ہو تو اس عالم میں آخر کیا دکھائی دے
روانی اس کی اک طوفانِ وجد و حال ہے گویا
کہ جو پرزہ ہے اک بپھرا ہوا قوال ہے گویا

شکستہ ساز میں بھی، محشرِ نغمات رکھتی ہے
توانائی نہیں رکھتی مگر جذبات رکھتی ہے
پرانے ماڈلوں میں کوئی اونچی ذات رکھتی ہے
ابھی پچھلی صدی کے بعض پرزہ جات رکھتی ہے

غمِ دوراں سے اب تو یہ بھی نوبت آ گئی اکثر
کسی مرغی سے ٹکرائی تو خود چکرا گئی اکثر

ہزاروں حادثے دیکھے، زمانی بھی، مکانی بھی
بہت سے روگ پالے ہیں زراہِ قدردانی بھی
خجل اس سخت جانی پر ہے مرگِ ناگہانی بھی
خداوندا نہ کوئی چیز ہو اتنی پرانی بھی

کبھی وقت خرام آیا تو ٹائر کا سلام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

## مشق

۱۔ پرانی موٹر کی شاعر نے کون کون سی خرابیاں بیان کی ہیں ؟

۲۔ "بزرگوں کی طرح کچھ کھانس کر خاموش ہو جانا مسلمانوں کی صورت دفعتاً پرجوش ہو جانا"
تشریح کیجیے۔

۳۔ قافیے کی تعریف کیجیے۔ تین اشعار لکھ کر ان میں قافیے کی نشان دہی کیجیے۔

# غزلیات

## میر تقی میرؔ

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیداد گری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی، پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

(۲)

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
برنگِ صوتِ جرس تجھ سے دور ہوں تنہا
خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری
اسی سے دور رہا اصل مدعا جو تھا
گئی یہ عمرِ عزیز آہ! رائیگاں میری
ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری
دیا دکھائی مجھے تو اُسی کا جلوہ میؔر
پڑی جہان میں جاکر نظر جہاں میری

(۳)

جو اس شور سے میؔر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا
میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
بس اے میؔر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

(۴)

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش
رہتی اک آدھ دن بہار اے کاش

یہ جو دو آنکھ مند گئیں میری !
اس پہ وا ہوتیں ایک بار اے کاش

کن نے اپنی مصیبتیں نہ گنیں
رکھتے میرے بھی غم شمار اے کاش

جان آخر تو جانے والی تھی
اُن پہ کی ہوتی میں نثار اے کاش

اس میں راہ سخن نکلتی تھی
شعر ہوتا ترا شعار اے کاش

شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر
اس سے ہوتے نہ ہم دو چار اے کاش

بے اجل میرؔ اب پڑا مرنا
عشق کرتے نہ اختیار اے کاش

# خواجہ حیدر علی آتش

## (۱)

ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی، بہار راہ میں ہے

گدا نواز کوئی شہ سوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر نہ کوئی دیار راہ میں ہے

طریقِ عشق میں اے دل! عصائے آہ ہے شرط
کہیں چڑھاؤ کسی جا اتار راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے

نہ جائیں آپ ابھی دوپہر ہے گرمی کی
بہت سی گرد بہت سا غبار راہ میں ہے

تلاشِ یار میں کیا ڈھونڈیئے کسی کا ساتھ
ہمارا سایہ ہمیں ناگوار راہ میں ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

پتا یہ کوچہ قاتل کا سُن رکھ اے قاصد!
بجائے سنگ نشاں اک مزار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

(۲)

یہ آرزو تھی تجھے گل کے رو برو کرتے
ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسر ہُوا تو خُوب ہُوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیر زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پُوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتشؔ
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

(۳)

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا؟

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد! اسیرِ دامِ رگ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے دام و دانہ کیا

طبل و علَم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبض رُوح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا
ترچھی نگہ سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے گا اڑے گا نشانہ باز
یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتشؔ غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

(۴)

آئے بہار جائے خزاں ہو چمن درست
بیمار سال بھر کے نظر آئیں تندرست
حالِ شکستہ کا جو کبھی کچھ بیاں کیا
نکلا نہ ایک اپنی زباں سے سخن درست
عشاق و بوالہوس کو وہ پہچان جائیں گے
چھپتی نہیں ہے صورتِ بیمار و تندرست
آرائشِ جمال کو مشاطہ چاہیے
بے باغباں کے رہ نہیں سکتا چمن درست
کم شاعری بھی نسخہ اکسیر سے نہیں
مستغنی ہو گیا جسے آیا یہ فن درست
غربت زدوں کے حال کا افسانہ چھیڑتے
ہوتی اگر طبیعتِ اہلِ وطن درست
آتشؔ وہی بہار کا عالم ہے باغ میں
تا حال ہے دماغ ہوائے چمن درست

## حکیم مومن خان مومنؔ

(۱)

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے

شوق کم ملنے سے اندوہ فزا ہوتا ہے
ہائے پرہیز سے یہ درد سوا ہوتا ہے

ہو کے آزردہ پشیماں ہوں کہ میں جس سے کہوں
وہی کہوے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے

ناتوانی مری مت پوچھ کہوں کیا ہمدم
بات کہنے میں مرا دم ہی ہوا ہوتا ہے

ہو نہ بیتاب غمِ ہجرِ بتاں میں مومنؔ
دیکھ دو دن میں بس اب فضلِ خدا ہوتا ہے

(۲)

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو
عذر کچھ چاہیے ستانے کو

صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال
ہائے کیا ہوگیا زمانے کو

برق کا آسمان پر ہے دماغ
پھونک کر میرے آشیانے کو

شکوہ ہے غیر کی کدورت کا
سو مرے خاک میں ملانے کو

کوئی دم ہم جہاں میں بیٹھے ہیں
آسماں کے ستم اٹھانے کو

چل کے کعبہ میں سجدہ کر مومنؔ
چھوڑ اس بُت کے آستانے کو

(۳)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

نارسائی سے دم رُکے تو رُکے    میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا    جب کوئی دُوسرا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

(۴)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

"ہم سے نہ بولو تم" اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

بے زار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

بے روئے مثلِ ابر نہ نکلا غبارِ دل
کہتے تھے ان کو برقِ تبسم ہنسی سے ہم

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گل تو دور
اور سُوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

## علامہ اقبالؒ

(۱)

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانہ دل کے مکینوں میں

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں!
کہ لیلےٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا! کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو، موجِ نفس ان کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک، اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

محبّت کے لیے دل ڈھونڈھ! کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے، جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے، محبّت کے، قرینوں میں

برا سمجھوں انھیں، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبالؔ اپنے نکتہ چینوں میں

(۲)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں
رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں
عروسِ لالہ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں
جسے کساد سمجھتے ہیں تاجرانِ فرنگ
شے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں
بڑا کریم ہے اقبالؔ بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

(۳)

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

چھپتی نہیں ہے یہ نگہ شوق ، ہم نشیں!
پھر اور کس طرح انھیں دیکھا کرے کوئی
نظارے کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

(۴)

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے ، نیلے نیلے ، پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے! آتا ہے دھن جاتا ہے دھن!
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

# فیض احمد فیضؔ

(۱)

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے
دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
خونِ دلِ وحشی کا صلا کیوں نہیں دیتے
ہاں نکتہ وِرو لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گرو ساز صدا کیوں نہیں دیتے
بربادیِ دل جبر نہیں فیضؔ کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

(۲)

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا
ادھر ایک حرف کہ کشتنی، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سن کے اڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا
جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار! ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

(۳)

مشکل ہیں اگر حالات وہاں ، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو ، کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں
جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا ، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے ۔ اس جاں کی تو کوئی بات نہیں
میدانِ وفا دربار نہیں ، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں ، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں
گر بازی عشق کی بازی ہے ، جو چاہو لگا دو ۔ ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

# ناصر کاظمی

(۱)

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا، کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ
بس ایک موتی سی چھب دکھاکر، بس ایک میٹھی سی دھن سناکر
ستارۂ شام بن کے آیا، برنگِ خوابِ سحر گیا وہ
خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم، نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہردم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں، مرے تو دل میں اتر گیا وہ
کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی، بدل چلا رنگ آسماں بھی
جو رات بھاری تھی ٹل گئی ہے، جو دن کڑا تھا گزر گیا وہ
شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں، گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہم سفر تھا، مثالِ گردِ سفر گیا وہ
ہوس کی بنیاد پر نہ ٹھہرا، کسی بھی امید کا گھروندا
چلی ذرا سی ہوا مخالف، غبار بن کر بکھر گیا وہ
بس ایک منزل ہے بوالہوس کی، ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اس میں، گزر گیا میں، ٹھہر گیا وہ
وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اُس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ
وہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصرؔ
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا، پھر نجانے کدھر گیا وہ

(۲)

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں
رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو!
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں
یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں
اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

(۳)

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گل اداس کر کے مجھے
میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے
میں رو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے
میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے ابھر ابھر کے مجھے
ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انھیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے
ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غمِ دنیا
بلا رہا ہے کوئی بام سے اتر کے مجھے
پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سنا گئی ہے فسانے اِدھر اُدھر کے مجھے

# مشق

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے　　تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے
بربادیٔ دل جبر نہیں فیضؔ کسی کا　　وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

الف : قافیہ ——— ان حروف اور حرکات کے مجموعے کو کہتے ہیں جو اشعار کے آخر میں ردیف سے پہلے آئے۔ اس کے ہم صوت الفاظ غزل یا قصیدہ وغیرہ کے ہر شعر میں پائے جاتے ہیں۔ جیسے اوپر کے اشعار میں دوا، شفا، اٹھا اور بھلا کے الفاظ قافیے ہیں۔

ب : ردیف ——— وہ لفظ یا الفاظ جو قافیے کے بعد بار بار دہرائے جائیں جیسے اوپر دیئے گئے اشعار میں "کیوں نہیں دیتے" ردیف ہے۔

ج : مطلع ——— غزل یا قصیدہ کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرعوں میں ردیف اور قافیہ موجود ہو جیسے اشعار بالا میں پہلا شعر۔

د : بیت ——— ایسے شعر کو کہتے ہیں جو نہ مطلع ہو اور نہ مقطع جیسے مندرجہ بالا اشعار میں دوسرا شعر۔

ہ : مقطع ——— غزل یا قصیدے کے آخری شعر کو کہتے ہیں جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔

۱ : ان تعریفوں کی روشنی میں اپنی پڑھی ہوئی غزلیات میں سے مطلع، مقطع، قافیہ اور ردیف چن کر الگ الگ لکھیے۔

۲ : آپ نے میرؔ، آتشؔ، اقبالؔ، مومنؔ، فیضؔ اور ناصر کاظمی کی غزلیں پڑھی ہیں ان غزلوں کی روشنی میں ان کی جو خصوصیات آپ کو نظر آتی ہیں انھیں مختصر الفاظ میں لکھیے۔

# لازمی اُردو
# امتحانی پرچہ جات کے بارے میں ہدایات

لوازمہ نصاب اور نمبروں کی تقسیم :

اردو لازمی کے سو سو نمبروں کے دو پرچے ہوں گے - پرچہ الف نثر اور نظم پر مشتمل ہوگا - نثر کے ۶۵ اور نظم کے ۳۵ نمبر ہوں گے - پرچہ "ب" قواعد اور انشاء پر مشتمل ہوگا - انشاء کے ۶۵ اور قواعد کے ۳۵ نمبر ہوں گے -

پرچہ الف کے لوازمہ نصاب کی تقسیم :-

پرچہ "الف" کے لوازمہ نصاب کے متعلق عنوانات کے نمبروں کی تقسیم حسب ذیل ہوگی :-

| حصہ نثر :- | | | حصہ نظم : | | |
|---|---|---|---|---|---|
| | مضامین | ۱۵ نمبر | | نظم | ۲۵ نمبر |
| | افسانوی ادب | ۱۰ نمبر | | غزل | ۱۰ نمبر |
| | سفرنامہ | ۱۰ نمبر | | | ۳۵ نمبر |
| | سوانح اور شخصیت نگاری | ۱۰ نمبر | | | |
| | مکاتیب | ۵ نمبر | | | |
| | طنز و مزاح | ۱۰ نمبر | | | |
| | پاکستانی زبانوں کا ادب | ۵ نمبر | | | |
| | | ۶۵ نمبر | | | |

پرچہ "ب" کے لوازمہ نصاب کی تقسیم :-

پرچہ "ب" کے لوازمہ نصاب کے مشمولات کے نمبروں کی تقسیم حسب ذیل ہوگی :-

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱) قواعد :- | الف : | فاعل / مفعول کے ساتھ فعل کی مطابقت | ۵ نمبر |
| | ب : | مختلف حروف کا صحیح استعمال | ۸ نمبر |
| | ج : | تذکیر و تانیث ، ہجوں ، روزمرہ ، محاورہ اور مرکبات لفظی کا صحیح استعمال | ۸ نمبر |
| | د : | تشبیہ ، استعارہ ، تلمیح ، مطلع ، مقطع ، قافیہ ، ردیف کی تعریف اور مثالیں | ۵ نمبر |
| | ہ : | رموزِ اوقاف کا صحیح استعمال | ۵ نمبر |
| | و : | چند مصادر بطور امدادی فعل | ۴ نمبر |
| ۲) انشاء | | | ۶۵ نمبر |
| | | | ۱۰۰ نمبر |

این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور و منظور کردہ قومی ریویو کمیٹی
وفاقی وزارت تعلیم، حکومت پاکستان، بطور واحد نصابی کتاب برائے جماعت
یازدہم (اردو) برائے صوبہ سرحد و قبائلی علاقہ جات۔

## قومی ترانہ

پاک سرزمین شاد باد　　کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان　　ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سرزمین کا نظام　　قوّتِ اُخوّتِ عوام
قوم، مُلک، سلطنت　　پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد

پرچمِ ستارہ و ہلال　　رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال　　جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذُوالجلال۔

سیریل نمبر 10336　　عالمی معیاری کتاب نمبر 969-8563-05-9

| قیمت | تعداد اشاعت | کوڈ نمبر |
|---|---|---|
| 17.00 | 15000 | B-21/SPN/AI2(03) |

!!!!